

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU 188028**

UNIVERSAL  
LIBRARY



**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. ۹۲۳۵۴

Accession No. ۱۰۴۹۲

Author محمد حسین ابی بنی ع

۱۵۴۹۱

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.



”بڑے آدمیوں کے سوا نخی حالات ہمارے لئے بہترین مشعل ہدایت ہیں“

Checked 1975

# سوانح عمری

مولانا عثمانیت اللہ دہلوی

مرتبہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

نومبر ۱۹۳۹ء

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام ضمیمہ احمد خاں غوری پرنٹسریجھی)

حیدرآباد یک ڈپو، حیدرآباد دکن





مولوی عذایت اللہ دہلوی



# سوانح حیات مولانا عنایت اللہ

## مترجم اردو "سپینش اسلام"

(از شیخ محمد اسماعیل - سکریٹری "حالی کیڈمی" پانی پت)

والدین اور خاندان | مولوی محمد عنایت اللہ صاحب خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ مرحوم کے لائق فرزند ہیں۔ مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب مرحوم اردو زبان کے سب سے زیادہ کثیر التصانیف مولف۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم۔ زبردست انشا پرداز۔ بہت بڑے ماہر ریاضی و سائنس میونسٹریل کالج الہ آباد کے پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور سرسید مرحوم کے گہرے اور قلبی دوستوں میں سے پُرانی وضع کے ایک باکمال بزرگ تھے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب کی والدہ ایک بہت لائق خاتون اور سید زادی تھیں۔ مولوی صاحب کا خاندان شیخ صدیقی ہے۔

تاریخ پیدائش | آپ دہلی کے مشہور محلہ "قاضی واڑہ" میں دو شنبہ کے روز ۱۰ شعبان ۱۲۸۶ء مطابق ۱۵ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔

دہلی میں ابتدائی تعلیم | آپ کی عمر پانچ برس کی تھی کہ مولانا ذکاء اللہ صاحب نے آپ کے پڑھانے کے لئے ایک معلم لالہ شوچی رام کو مقرر کیا۔ کچھ دنوں اُن سے تعلیم پائی تھی کہ پھر آپ کو ماڈل سکول میں جو نارمل سکول دہلی سے متعلق کلاں محل میں تھا داخل کرادیا۔ کچھ عرصہ یہاں پڑھنے کے بعد شاہ جی کے چھتہ میں ایک گورنمنٹ سکول تھا وہاں بٹھا دیا۔ بعد میں وہاں سے اٹھا کر عربک سکول میں داخل کرادیا۔ یہاں تیسری جماعت میں پڑھتے تھے کہ مولانا ذکاء اللہ انھیں اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے تاکہ اپنی نگرانی میں بیٹے کی تعلیم کا مقول انتظام کر سکیں۔

دہلی سے الہ آباد تک | دہلی سے الہ آباد تک کس طرح پہنچے؟ اس کی بہت ہی دلچسپ اور پُرکٹھن کیفیت خود مولوی عنایت اللہ صاحب کی زبان سے سنئے :-

”غالباً جولائی ۱۹۱۷ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم جو اس وقت میورکالج اللہ آباد میں پروفیسر تھے گریجویٹ کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے اللہ آباد واپس جانے لگے۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لیجانا چاہا تاکہ اللہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ ماستہ میں سید صاحب (سرسید مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کر لیا۔ میری عمر اس وقت آٹھ برس کچھ ہینے کی تھی اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو انھوں نے ہم دونوں کو لگے لگایا۔ پیار کیا۔ اور کوئی ڈیڑھ گز قدم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا۔ مگر میں نے ضبط کیا اور دوڑ کر والد کے پاس چلا گیا اس خوف سے کہ کہیں مجھے روٹا دیکھ لیا تو پھر ساتھ نہ لیجائیں گے۔

آج کا دن میرے لئے نئے نئے تجربوں اور حیرتوں کا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی ریل میں نہ بیٹھا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا۔ کبھی اس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھنے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آ گیا ریل کھسکی۔ اسٹیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی بھیجا کبھی سانپ کی طرح لہرائی جتنا کاپل اترتے ہی فزائے بھرنے لگی۔ پتوں کی لئے دار آدازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے اب بعلوم ہوا کہ میدان رکھتے۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہیں تھا جو دنی کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور میرے وطن کی طرف چلے دوڑ کی چیزیں آہستہ اور پاس کی چیزیں بے تماشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے معلوم ہوتے۔ اوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دوڑ نظر آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا سا ہو جاتا۔ اور دینتہ نہ بھی ترچھی دھاروں

میں برسے لگتا۔ بادل کی گرج جسے سُن کر گھر میں ڈر لگا کرتا تھا۔ اب یہاں سُنانی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی۔ اور ٹرین اس گھٹا اور اندھیرے کو پیچھے چھوڑ روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی اسٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹری بدلتا اور پھر کون رٹکا ایسا ہو گا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ میاے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ۔ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک بچھڑا سقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا ٹرین کو چلتا کرنا۔ اور اپنی گاڑی کی طرف آچلتی ریل میں دوڑ کر اس کے پائے دان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے اسٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آتا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ کے فُوقوں میں آدھا چھپا ہے مگر چھتے چلتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور رز سے اسٹیشن کی اُونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم اور انگریزی ہوٹلوں کے چمکنے ساز و سامان کی جھلک دکھا کر رُک جانا۔ ٹکٹ کلکٹروں کا چلتی گاڑی میں آن پہنچنا۔ ٹیلیوں اور مسافروں کا شور۔ سودے والوں کی بے ٹکی پولیاں گویہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دُنیا کے مُشاہدوں کا ایک دفتر کھُل گیا تھا۔ جو نئی چیز خود دیکھتا تھا چاہتا تھا کہ والد بھی اُسے دیکھیں۔ سوالوں کی انتہا نہ تھی مگر وہ زیادہ متوجہ نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی سے باہر مُنہ رکھنے کو بار بار منع کرتے تھے کبھی ذبح آنکھوں میں کونے کی خاک بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہار ایک دفعہ کچھ تھکن ہی معلوم ہوئی تو کھڑکی کے پاس سے مُنہ ہٹا لیا۔ آنکھیں ملتا رہا۔ پھر کھٹاں یاد آنے لگیں۔ دل گڑھا چُپ سی لگی۔ لیٹا اور نیند آگئی۔ سو کر اُٹھا۔ پھر مُنہ کھڑکی سے باہر تھا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آگیا۔ والد یہاں اُترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی سی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے

اور ایک بڑے سنگ کے سامنے برساتی میں اُگر گاڑی ٹھیکری۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دُور سے دیکھے تھے کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرنے کے بعد ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں جنس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کُرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور جنس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ٹٹی کے قریب ایک مینجر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ جکتی ہوئی چیزیں بہت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ مینجر کے قریب ہی کُرسی پر ایک بڑے بھاری بھر کم آدمی۔ سفید سر۔ سفید ڈاڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور اُن میں سلیپ جو مجھے فالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلا۔ مینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر پیٹھے تھے۔ یہ سیتد احمد خاں صاحب تھے جنھیں دتی کے بعض لوگ صرف ”علی گڈھ والا“ کہنا کافی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک نوٹ اور پرنٹری چیز سمجھے جاتے تھے۔ والد کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کُرسی سے اُچھٹکے اُٹھے۔ اور یہ کہہ کر کہ ”آپ آگئے“ والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا ”ارے یہ کون ہیں“ ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ خوب ہنسنے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت کو دیکھتا تھا۔ اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد عایشہ دے کر سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری۔ اور سفید براق سی پمخت گیری۔ دیواروں پر پلکا فیروزمی رنگ کہیں کہیں نہری پوکھڑوں میں تصویریں لگی ہوئیں جن میں پہاڑ۔ پتھے اور سبزہ زار نظر آتے تھے۔ اور سب پر ایک سکوت کا عالم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انھی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کونرس میرے لئے اس قدر پُر لطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی فائش گاہ بھی وہ لطف نہیں دے سکتی

اس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جباتیں کرتے کرتے چُپ ہو جاتے تھے تو پتکے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ کھٹ پیر سے تصویریں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کورٹس پر جو چیزیں راستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا تھا۔ یہ مجھ کو منصور کا مقبرہ معلوم ہوتا تھا۔ جسے میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اُس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچے۔

سید صاحب اس قدر محترم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت ڈبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے اور ان حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھتے تھے۔ میرے بڑے بھائی کُرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا۔ مگر میں نے نہ سنا کیونکہ بالکل عدیم الفرست تھا۔ سید صاحب کے قریب اُن کی میز کے پاس کھڑا رہا۔ اس وقت ایک اور چیز ایسی تھی جس کی طرف دیکھنے میں میں بالکل مٹھتا تھا۔ یہ سید صاحب کے لکھنے کی دوات تھی۔ اس کے اوپر کا ڈھکنا کہیں سونے کا کہیں چاندی کا ہو ہوشیر بیکر کا سر معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی تھی۔ اور اُس کی آنکھیں لال لال کینوں کی خوب چمکتی تھیں۔ آخر کار اس خواب حیرت سے جاگنا پڑا۔ سید صاحب نے پوچھا ”تم کیا پڑھتے ہو؟“ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا ”اُردو کی چوتھی (کتاب) ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری (کتاب) اور رائل ریڈر پڑھتا ہوں“ اس جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسنے لگے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میری وہ علم فضل باعث مسرت ہوا ہو۔ یہ دونوں صاحب باتیں بھی کرتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تہقہ بھی

لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذ والد کو دیئے۔ جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب کھنکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جو مصروفیت مجھ کو تھی وہ ان دونوں بزرگوں کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ مشیقل دہلیش تھی کہ میں کسی چیز کو اٹھا کر اُس سے کوئی ذاتی تجربہ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ اتنی جرأت ہوتی تھی کہ والد سے ایک ایک چیز کو پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کروں۔ اتنے میں ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ایک چھوٹے ٹپ سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی ہی سب آواز میں کہا ”پکھا روکو“ پکھا فوراً رُک گیا۔ اور سید صاحب نے بکس میں سے ایک چُرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی۔ اور جب دیا سلائی چُرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اور اب معلوم ہوا کہ جس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں تھی وہ چُرٹ کی تھی۔ اس آواز اور پھرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا۔ اور یہ اُس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔ جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب وغیرہ رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس بیٹھ کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ گو اس کمرے میں دلکش چیزیں کم تھیں مگر غسل خانہ کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کے کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے پہننے کے کمرے میں آئینہ کی خوبصورت مینر رکھ کر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ میں اُن سے ڈرا۔ کیونکہ اُن کو میرے ساتھ خاص دشمنی تھی۔ جہاں میں نے خوش ہو کر اُن کو ہاتھ لگایا اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر میرے حق میں مشکلیں پیدا کر دیتی تھیں۔

شام ہوتی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے اطراف میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پر ایک چوترہ تھا۔ اس پر بہت سی کڑیاں رکھی تھیں۔ کھانے کے کمرے کے سامنے گھاس کا وہ بڑا تختہ جس کے چاروں طرف سُرخ اینٹوں کی نایاں اور پھولوں کی کیا ریاں اور گوشے پر بڑے بڑے گلے رکھے تھے اس وقت موجود نہ تھا۔ یہاں چھوٹی

چھوٹی کیا ریوں میں گلاب کے درخت تھے اور کچی روشوں کے گرد ہندیوں کی بارڈ لگی تھی۔ ان سے جنوب کی جانب وہ چوتھو تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور غالباً اس ماہ کے بارہ تیرہ برس کے بعد اسی چوترہ کی جگہ ایک خوبصورت کمرہ بنایا گیا جو ”میاں مسعود“ کا مکتب کہلاتا تھا چوترے کے کنارے پھولوں کے گلے رکھے تھے اور تین طرف درخت تھے جو غالباً پھولوں کے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور والد پھر باتیں کرنے لگے اتنے میں سید صاحب کے چند دوست کاڑیوں سے اتر کر آئے۔ ان میں دو صاحب یاد ہیں ایک مولوی فرید الدین تھے اور دوسرے خواجہ محمد یوسف۔ مولوی فرید الدین صاحب آتے ہی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ان کی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں کیونکہ جو بات پوچھتے تھے اس طرح پوچھتے تھے جیسے میرے ہمیشہ کے جاننے والوں میں ہیں۔ حالانکہ میں نے انہیں آن ہی دیکھا تھا۔ اس موقع کی صرف ایک بات مجھے خوب یاد ہے۔ سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا ”مٹنہ کھولو“ میں نے مٹنہ کھولا۔ کہنے لگے ”ارے اس رٹکے کے مٹنہ میں سے تو خون نکل رہا ہے۔ تو بہ توبہ“ میں دلی سے جلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے مٹنہ بند کر لیا اور سمجھ گیا کہ پان کھانا بہت بُری بات ہے۔ گو جوان ہو کر پان کھانے کی عادت مدت تک نہ چھوڑی۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آکر کہا ”کھانا میز پر ہے“ سب لوگ اُٹھے۔ اور کھانے کے کمرے میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سپید چادر چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے کانٹے۔ ہاتھی دانت کے دستوں کی چھریاں رکھی تھیں۔ دیوار گیر لویوں کے علاوہ میز پر دو بڑے شاندار میز پ رٹون تھے۔ پکھا چل رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور قیل سوزیا دیا میری اللہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا جھکایا کرتی تھیں مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور پک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی ہجان آئے تو برتنے جاتے تھے۔ گلاس گرمیوں میں یا رمضان میں شربت

پینے کے لئے نکالے جاتے تھے۔ مائیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں پھر یاں اور چاندی کے کاٹنے میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا قتل سوز و رنج بھویا جاتا تھا۔ مگر اس کی صورت شکل اور ٹہٹائی روشنی ان لمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور تہمتوں پر پتھھے لگاتے سب دیک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تین چار سفید پوش نمازم اور ایک بڑی لمبی ڈاڑھی کا ڈبلا پتلا سوکھا مگر بے حد شہت اور تیز خانا سالا طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ میچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابی میں بڑھے خانا ماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے کچھ غور نہ کیا مگر وہ گھر کا سا نہ تھا۔ نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ جب ہم دونوں کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ ان بچوں کو ان کے پنگلوں پر لے جا کر سلا دو۔“

ہمارے پلنگ ڈرائنگ روم کے غرب رویہ برآمدے میں بچکھے تھے۔ اس زمانے میں یہاں دو ہزار آدمہ نہ تھا۔ اور نہ وہ ڈاکرہ تھا جو سید محمود والا کمرہ مشہور تھا میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ برسات شروع ہو گئی تھی۔ برآمدہ کے سامنے کیا ریوں میں پانی بھرا تھا اور ان میں ہزار ہا مینڈک بول رہے تھے۔ کہیں ہلکی ٹرٹرا اور کہیں تیز ٹرٹر کبھی ڈکیوں کی آوازیں اور پھر یہ سب مل کر ایسا شور پیدا کرتی تھیں کہ میں تھوڑی دیر تک جاگتا ہی رہا۔ پھر جب نیند آنے لگی تو یہ شور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کہیں دور کسی بڑی دیگ میں پانی جو شس کھا رہا ہو۔

صبح ہوتے چلیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت میسوں سوال والہ سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا کہ کیا الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی۔ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔ اُس دن کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب کچھ دن چڑھا تو ایک فنڈ دو گھوڑوں

کی آئی۔ اور مولوی فرید الدین صاحب اس میں سے اترے۔ اور تھوڑی دیر سید صاحب سے باتیں کر کے ہم سب کو اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ سید صاحب ساتھ نہ تھے۔ رستہ میں کالج کے احاطہ میں سے گزرے۔ دو تین پھونس کے بیچلے۔ اور ایک جگہ دو ایک کوٹھڑیاں سی لال اینٹوں اور ڈاٹ کی نظر آئیں۔ جیسی جگہ کو کبھی کبھی انگریزی چھاؤنیوں میں دیکھنے میں آئیں۔ مدرسے کے لڑکے کہیں نظر نہیں آتے۔ اور نہ گاڑی سے اترنے کی نوبت آئی۔ البتہ جب کالج کے ایک دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں جا بجا پانی کھڑا تھا۔ رات کو مینہ خوب برس چکا تھا یہاں گاڑی کے پینے دلدل میں پھنس گئے۔ گھوڑے بگڑنے لگے۔ سب لوگ گاڑی سے اترے اور زور لگا کر گاڑی کو آگے کھسکایا۔ دروازے پر پہنچ کر سب اترے۔ دروازے کے دونوں پیل پالیوں پر سنگ مرمر کی کوٹھیں لگی تھیں۔ میں نے انگریزی میں سید ظہور حسین اور گیت کا تحفا جلدی سے پڑھ دیا۔ مولوی فرید الدین صاحب نے جھٹ پٹھ ٹھونکی اور کہا "ارے تو انگریزی بھی پڑھنی جانتا ہے" دروازے سے علی ہونی مشرق کی طرف احاطہ کی سنگین جالیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میں جالیوں پر لوگوں کے نام پڑھتا ہوا ڈور تک دوڑا چلا گیا۔ والد نے آواز سے کہہ لیا۔ اور اب ہم سب مولوی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ (مولوی صاحب اُس کوٹھی میں رہتے تھے جو سائٹنگ سوسائٹی کے باغ سے بہت قریب تھی۔ اسے اصل میں سید صاحب نے اپنے رہنے کے لئے جب وہ علی گڑھ میں صدر الصدور تھے بنوایا تھا مگر غالباً ولایت سے آنے کے بعد قرضہ بڑھا اور مولوی سید صاحب صاحب کے ہاتھ سے فروخت کر دیا۔ آجکل معلوم نہیں وہ کیوں بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور ہے) اس بجے کے قریب سب نے مولوی صاحب ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ اب یہ یاد نہیں آتا کہ ہم سب صاحب کی کوٹھی پر کب اور کس طرح واپس گئے۔

والد نے علی گڑھ میں ایک دن کی جگہ جو ان کا معمول تھا دو دن قیام کیا۔ اس خیال سے کہ اگر ماں کی جدائی سے بچوں کی صحت پر بڑا اثر ہو تو دئی واپس کر دیں۔ بڑے بھائی کو گھر یاد آنے لگا تھا اور وہ سست بھی تھے۔ مگر میرے کہنے سے آگے چلنے پر تیار ہو گئے تیسرے دن اسی وقت کی ریل سے جس سے علی گڑھ پہنچتے تھے الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن

سورج ابھی اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساتھ آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کے طرز معاشرت پر یہ چھوٹا سا داغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر ان کے گھر کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اور یہ شوق پیدا ہوا کہ اب جہاں رہوں وہاں کی ہوا بھی ایسی ہی اچھی ہے ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ پھول ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف اور پاکیزہ چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ کوئی چیز میل نہ ہو۔ یہ خیال دہ تھا جس کا بہت کچھ اثر اور شوق تمام عمر رہا اور اب تک ہے۔

صبح ہی ریل سے اتر کر گھر پہنچے۔ مگر نہ وہ علی گڑھ تھا اور نہ سید صاحب کی کوٹھی اور اس کا باغ اور عدہ سامان تھا۔ مکان بڑا تھا۔ چاندنیاں اُبل بھی ہوئی تھیں۔ سب چیزیں سیلتے سے رکھی تھیں خصوصاً والد کی کتابوں کی بڑی الماری میں رنگ برنگ کی جلدیں اور ان پر سنہری حروف بہت اچھے سلوم ہوتے تھے۔ پہنچتے ہی تھوڑی دیر تک گھر کا جائزہ لیتا پھرا۔ دالان کو ٹھڑیاں۔ تہ خانہ کے موکھے جھانک کر دیکھے۔ نوکروں سے جو خاص طور پر متوجہ تھے۔ جرح کی کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے؛ اور اس کے بعد دوڑ کر اپنے پنگ پر آن بیٹھا۔ آسمان پر تارک بادل چھائے تھے۔ اندھیرے سے جی گھرایا۔ اور اب چار دن کے بعد اٹل یاد آئیں اور بہت یاد آئیں۔ مٹی کے گھر کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ ”اب اماں جان اشراق کی نماز پڑھ کر جاننا ز پڑھی تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔ پکانے والی ماماں پوچھ رہی ہوگی ”بیوی کیا کہے گا؟“ انھوں نے کچھ بھی جواب نہ دیا ہو گا کیونکہ ہمارے لئے دُعا میں کہہ رہی ہوں گی۔ اور کہا بھی ہو گا تو یہی کہا ہو گا کہ بچے تو خدا رکھے سدھارے، کیا بتاؤں کیا پکاؤ گی“ (اُس وقت تک صرف ہم دو بھائی تھے۔ اس لئے ہمارے چلے آنے سے والد بائیں ہاتھ گئیں گئیں اور صورتیں بھی خیال میں آنے لگیں۔ ”یہاں دھوپ ہوگی۔ وہاں تھوڑے ہوگی۔ کوٹھی کی سب سے اونچی مُنڈیر پر چیل روزا کر میٹھا کرتی تھی اب آگسی ہوگی پتھے پر سینائیں بڑتی ہوں گی۔ ایک آدھ کو ابھی باورچی خانہ کی طرف اتر آیا ہو گا۔“ یہ سب صورتیں تو پڑھائیوں کی طرح آئیں اور گئیں۔ مگرتاں کی ایک شے ایسی تھی کہ جہاں کہیں کو دوسے تھک کر

چپ بیٹھا اور وہ روشن ہو گئی۔ پتنگ پر دیر تک منہ پیٹے چپکے چپکے روتا رہتا۔ رونے سے بڑھ کر تکلیف اس کے چھپانے میں ہوتی تھی یہی ڈر رہتا کہ اگر ظاہر ہو گیا تو دلی واپس جانا پڑے گا اس خیال سے دل شرمندہ ہوتا تھا۔ اور یہ منصوبہ بھی غارت ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا کمرہ خوب آراستہ کر کے اُس میں بڑھا کروں گا۔

اللہ آباد میں کوئی کمرہ تو ایسا نہ ملا جسے آراستہ کرنا لیکن پڑھنے کی تین فٹ لمبی دو فٹ چوڑی میز جو بل اُسے میں نے رفتہ رفتہ اپنے لئے ایک نہایت وسیع اور خوبصورت ڈینا بنایا سامان کچھ بھی نہ تھا۔ میز کی سبز چادر پر شیشے کی ایک دو ات تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے ٹیبنی کے کھلونے تھے۔ کچھ کتابیں اور شوق کی کاپیاں تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹمپس تھا جو اٹلی چابی دینے سے کبھی ٹھیک نہ چلا۔ ایک دندانے بڑا نوک ٹوٹا چاقو بھی تھا جو کبھی کھویا جاتا تھا۔ کبھی مل جاتا تھا۔ دو واسطی اور دو انگریزی قلم تھے جنہیں ہم اُس زمانے میں ”ڈنک“ کہتے تھے۔ دو چار رنگین روشنائیوں کی سپدیاں اور کئی رنگ کی پنسلیں تھیں۔ ایک بہت مختصر سا ڈوڈیا رنگ کے گلوب کا ایمپ بھی تھا جو دن کو بھی میری میز سے ہٹنے نہ پاتا تھا۔ رنگین روشنائیاں اونپنسلیں شرط زندگی تھیں۔ کیونکہ جب کوئی انگریزی کی نئی ریڈر شروع کی جاتی تو اس کا سبق پڑھنے سے پہلے اس کی تمام تصویروں میں رنگ بھر دینا بڑا ضروری کام تھا۔ حالانکہ والد کبھی دفنہ ناراض بھی ہوئے کہ کتاب خراب نہیں کیا کرتے۔ مگر میں اپنی مصوری کا نمونہ اُن کو ضرور دکھا دیتا تھا۔ یہ کرس کو با درہتا کہ بھر خا ہوں گے۔ جے پور کا بنا ہوا سنگ سفید کا ایک رنگین گینڈا تھا جس کے پاؤں میں ہندی۔ ماتھے پر ٹیکا۔ اور ناک پر سنہری رنگ کا ایک سینگ تھا۔ یہ روانی عمر اور شیرینی مذاق کے ساتھ ساتھ کچھ کم نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے میری خدمت میں رہا۔ کبھی گرجن میں ڈور بندھی اور چابک مارا کر چلایا گیا کبھی پیار کی باتیں ہوتیں۔ کبھی سخت دست سنتا رہا۔ میلا کھپلا ہوا تو غسل اتنے دے لے کہ رفتہ رفتہ اُس کا سارا رنگ اڑ گیا۔ نہ پاؤں کی ہندی رہی نہ ماتھے کا ٹیکا۔ کبھی قنبلی یا چاقو سے ناک کے سینگ پر حسب ضرورت ترمیم کی گئی۔ ناک بمس ٹوٹی اور چاقو قنبلی کو بھی زوال آیا۔ کبھی اُس سے دیوار میں کلبیں ٹھونکنے کے لئے ہتھوڑی کا کام

لیا گیا۔ اور جب میں اور وہ دونوں پیش کے قابل ہوئے تو مدتوں میرے کاغذوں کو پیر و پیٹ کی جگہ میرے فرزند بن کر بیٹھا۔ آخر کار حیدرآباد کے ایک نوکر نے تجھ پر گر کر اُس کی ٹھیک اور چاروں پاؤں توڑ دیئے۔ چنانچہ اب وہ اسی حال سے بچڑھٹوں کے ایک پُرلے کس میں بندھیے تا بوت میں مصر کی ممی ہو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ بے جان کھلوانا میرے لئے برسوں تک ایک زندہ ہستی رہا۔ میرے بعض بچپن کے دوستوں سے بھی اس کی ملاقات تھی اور بڑھے ہو کر بھی وہ کبھی کبھی اس کی نیر و عنایت پوچھ لیا کرتے تھے۔ ایک خوبصورت کمرے کی حسرت تو صرف پڑھنے کی میز کے آراستہ کرنے میں پوری ہوئی۔ مگر گھر میں درخت مطلق نہ تھے۔ صحن بڑا تھا۔ اس کے ایک گوشہ میں میرے اصرار سے والد نے ایک چمن بنوایا تھا اس میں دو ایک درخت پھلوں کے بانی پھولوں کے لگائے گئے۔ اس وقت کا شوق کیا بتاؤں کیا تھا۔ نئی نئی باتیں نکالا کرتا تھا جس دن خود کو فی تیج بونا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب میں دن اور تاریخ لکھ لیتا تھا۔ جب وہ بھٹوتا تھا تو اس کی تاریخ بھی درج کرتا تھا۔ کچھ دنوں یہ التزام رہا مگر پھر اور باتوں میں دھیان بٹا۔ اور جہاں اور اکثر چیزیں روز کھوئی جاتی تھیں وہ کتاب بھی کھوئی گئی۔ مجھ کو اپنی سب چیزوں سے محبت تھی۔ مگر وہ سب بے وفا تھیں۔ جب ڈھونڈتا تھا کہیں نہ کہیں چھپ بیٹھتی تھیں۔ اور غفلت کا الزام والد مجھ کو دیتے تھے۔“

اللہ آباد کا قیام | علی گڑھ سے جس وقت مولوی عنایت اللہ علیہ السلام نے تیسری کی طرز معاشرت اور اُن کے گرد و پیش کی صفائی اور لطافت کا اُن کے ننھے دل پر اس قدر گہرا اور دیرپا اثر ہوا کہ وہ اُسے تمام عمر بھولے ان کے ہیشیا رومارغ نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ انھیں بھی ایسی ہی صفائی کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اور اُن کے گرد و پیش کی چیزیں بھی اتنی ہی لطیف اور نازک ہونی چاہئیں جیسی وہ علی گڑھ میں سید صاحب کے بنگلے میں دیکھ آئے تھے۔ بعد کی زندگی میں اُن کی یہ خواہش اُن کی طبیعت نائیزہ بن گئی۔ اور اب جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، اُن کی اس صفائی پسندی میں فرق نہیں آیا۔ وہ اگرچہ سادگی کے ساتھ رہتے ہیں، مگر کھانے پینے اور پھنے، لکھنے پڑھنے، غرض ہر چیز میں صفائی اور لطافت کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

الہ آباد پہنچتے ہی انھوں نے سرسید کی طرز سکونت کی چھوٹی سی نقلی انارنی شروع کر دی! اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انھوں نے اپنی نیرنگ چکتی ہوئی نیردس سجایا۔ اپنے مکان کے صحن میں چھوٹا سا چمن لگوایا اور خود اس کے مالی بنے الہ آباد کے مختلف قیام و پھر وہاں سے تعلیم کے لئے علی گڑھ آنے کا حال بھی مولوی عنایت اللہ ہی کی زبانی سنتے۔

الہ آباد میں تعلیم کی رفتار | الہ آباد میں شروع میں ہم دونوں بھائیوں کے لئے ایک ٹیچر مقرر کر دیا گیا جو ہم کو انگریزی اور حساب پڑھاتا تھا۔ اولیک مولوی صاحب فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے میرے بڑے بھائی کو گھراس قدر یاد آیا کہ آخر کار ایک مہینے کے بعد والدہ نے انہیں دکن بلایا۔ جہاں مجھے بھی تھا۔ مگر میں کب ملتا تھا۔ والد کے پاس تنہا رہا۔ کبھی گورنمنٹ سکول الہ آباد میں پڑھا۔ اور کبھی انگریزوں کے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ سکول میں جو مسٹر سکاٹ نامی ایک انگریز نے قائم کیا تھا، اور جس میں مسٹر سکاٹ کے ساتھ ان کی بیوی اور بہن بھی بچوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ اس سکول میں صرف دو ہندوستانی طالب علم تھے۔ ایک میں اور ایک بنگالی لڑکا۔ باقی سب انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔

مڈل کے امتحان میں ناکامی | دو برس تک اس طرح پڑھ کر غالباً ۱۸۵۷ء کے شروع میں میں نے مڈل کا امتحان پرائیویٹ دیا۔ جس میں سب مضمونوں میں تو پاس تھا مگر فارسی میں نفل ہو گیا۔ تنو نمبروں میں سے ۴۰ نمبر آنے چاہئیں تھے۔ لیکن مجھے ۳۶ ملے۔ کچھ دنوں تک اس ناکامی کی بڑی شرمندگی رہی۔ فارسی کے امتحان مولوی امجد علی صاحب ایم۔ اے تھے۔ جن کا تعلق اس وقت اودھ کے سررشتہ تعلیم سے تھا۔ بعد کے زمانے میں جب وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہو کر آئے اور میں ان کا کاشا گرد ہوا تو میں نے ایک دن شکایت کی کہ آپ نے مجھے نفل کر دیا تھا۔ میں کہ وہ بہت مہنے، اور کہنے لگے "اوہو! بڑا فسوس ہوا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو۔ ورنہ ضرور پاس کر دیتا۔"

سید صاحب کا الہ آباد آنا | ایک مرتبہ غالباً ۱۸۵۷ء میں سید صاحب بہمنی سے علی گڑھ جاتے ہوئے والد کے پاس چند گھنٹے ٹھہرے۔ باہر کے دالان میں بڑے بڑے محنت بکھے ہوئے تھے۔

ان پر سفید چاندنی اور ایک بڑا سا گاؤں کی رہتا تھا۔ سید صاحب دن بھر اسی پر بیٹھے رہے، میں پاس گیا تو پوچھنے لگے "اب تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے جہاں اور کتا میں اپنے پڑھنے کی بتائیں وہاں سکندر نامہ کا بھی نام لیا۔ کہنے لگے "اچھا ہم ایک مصرعہ پڑھتے ہیں، اس کا

مطلب بتاؤ۔ میں نے کہا۔ فرمائیے۔ سید صاحب نے کہا۔

ع تو فخر خراس و فاسا قظ از و

میں نے فوراً معنی کہے ”تو خراسان کا فخر اور اس میں سے ف نکال دی ہے“ سید صاحب نے کہا ”کس میں سے نکال دی ہے؟“ میں نے کہا ”فخر میں سے“ کہنے لگے ”پھر کیا رہا؟“ میں نے کہا ”خر“ اس پر انھوں نے بڑے زور کا قبضہ لگایا۔ جب وہ ہنسنے تو میں اس لطیف کو سمجھا۔ معنی بتلانے کے وقت مجھ کو مطلق خیال نہ تھا کہ میں گدھا بنا یا جا رہا ہوں۔

بعد ازاں ایک اور مصرع سید صاحب نے مجھ سے پوچھا جس میں ”احول“ کا لفظ آتا تھا میں نے کہا مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے۔ اگر آپ بتادیں تو میں مصرع کا ترجمہ کر دوں گا سید صاحب نے کہا ”بھینگے کو کہتے ہیں“ اس پر میں نے نوراً سارے مصرع کے معنی بتائے سید صاحب اس بات سے بڑے خوش ہوئے کہ جس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہ تھے اس کے پوچھنے میں میں نے کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ اور میرے والد سے کہنے لگے ”اس لڑکے کو اب ضرور علی گڑھ بھیج دینا چاہیے“

اگرچہ اس موقع پر سید صاحب صرف ۱۲ گھنٹے الہ آباد میں ٹھہرے تھے مگر والد کے تمام دوستوں میں غل مچ گیا کہ ”علی گڑھ کے پیر نیچر منشی ذکار اللہ کے مکان پر مقیم ہیں۔“ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی تھی کہ اسی دن اتفاقاً منشی غلام غوث صاحب کا حجام ہمارے یہاں آیا۔ یہ شخص بڑا پکا مسلمان اور صاحبی تھا۔ کسی مسلمان کی ڈاڑھی نہیں مونڈتا تھا۔ کپڑے بھی منشی حساباً کی وضع کے بہت اُبلے پہنتا تھا۔ (غالباً ان کی اتارن ہوتے تھے) سید صاحب نے اس سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کٹوائے۔ سید صاحب کے ناخنوں کے چھپے گوشت آیا ہوا تھا۔ حجام کچھ اس گھبراہٹ میں کہ یہ علی گڑھ کے پیر نیچر ہیں۔ اور کپھان کی شکل و صورت دیکھ کر ایسا گھبرا یا کہ ایک انگلی کا ناخن کاٹنے میں گوشت بھی ساتھ کاٹ دیا۔ سید صاحب نے اس صلیب سے اُسے ایک چوتی دی۔ یہاں سے نکلنے ہی حجام نے والد کے تمام دوستوں میں یہ خبر پہنچا دی۔ الہ آباد میں والد کے بہت سے مسلمان دوست والد کے مذہبی خیالات سے اس بنا پر کہ وہ سید صاحب اور ہمدی علی خاں صاحب وغیرہ کے مننے والوں میں سے تھے، بدگمان رہتے

تھے۔ بعضے دوست ایسے بھی تھے جو ہمارے گھر کا پانی اس خیال سے نہیں پیتے تھے کہ پانی پیتے ہی کہیں ہم بھی نیچری نہ ہو جائیں۔

الآباد سے بار بار علی گڑھ آنا | آلآباد کے چند سالہ قیام میں علی گڑھ سے میرا یہ تعلق رہا کہ جب کبھی والد تھیلوں میں دہلی جاتے تھے تو علی گڑھ میں ضرور قیام کرتے تھے۔ اور میں ماں کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح والد دہلی جاتے ہوئے سید صاحب کے پاس ٹھہرے۔ میں ہمراہ تھا۔ اس زمانے میں سید صاحب گھانس کا تختہ بنا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ خواجہ محمد یوسف صاحب آگے۔ اور باتوں باتوں میں انھوں نے سید صاحب سے کہا کہ آپ نے اس ٹھوڑی سی زمین میں گھانس لگانے میں صد ہار روپے صرف کر دیئے۔ سید صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ ”تم نے نبی شاد کی ہے۔ بیوی کے لئے گھنسا پاتا اور اچھے اچھے کپڑے بنا کر تمہارا بڑا دل خوش ہوا ہوگا۔ مجھ بڑے کی شاد کی اسی میں ہے کہ گھانس پھونس لگا کر دل خوش کر لوں“

علی گڑھ میں تعلیم پانے کا شوق | اس بار بار کے آنے جانے سے مجھ کو از حد شوق پیدا ہو گیا کہ میں بھی علی گڑھ میں تعلیم پاؤں۔ اور اس کے لئے میں نے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ الآباد میں والد کے پاس ”علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ“ آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے ٹائپ کے اردو حروف پڑھنے کی بہارت پیدا کر لی۔ اس پرچہ میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی وہ لڑکوں کے کھیل تماشوں کی رپورٹیں تھیں جن میں طالب علموں کے نام بھی چھپا کرتے تھے۔

مُسدس حالی کو بھی میں اس زمانے میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ جو نئی نئی والد کے پاس آتی تھی۔ مجھے اس کا دیباچہ بہت پسند تھا۔ مطلب تو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر شروع کے بہت سے جملے میں نے حفظ کر لئے تھے۔

علی گڑھ جانے کی تیاری | اب وقت آ گیا تھا کہ ہماری مدت کی آرزو پوری ہوئی۔ والد صاحب ہماری تعلیم کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ سید صاحب کے کہنے پر انھوں نے مہتمم قصد کر لیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو وہ علی گڑھ بھیج دیں گے۔ چنانچہ بڑے دن کی تعطیل میں جب میں والد کے ساتھ

دہلی گیا تو انھوں نے وہاں مجھ کو حساب اور اقلیدس کی انگریزی اصطلاحیں یاد کرائیں۔ ایک  
 میں نے حساب اور ہندسہ اُردو میں پڑھا تھا جس میں عربی کی اصطلاحیں متعل تھیں۔ علی گڑھ میں  
 یہ دونوں چیزیں انگریزی میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مولوی مسیح اللہ خاں صاحب بھی تھیں۔ میں  
 دہلی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن مجھے ساتھ لے کر چاندنی چوک گئے۔ اور وہاں ہم دونوں بھائیوں  
 کے واسطے علی گڑھ لے جانے کے لئے۔ امان خرید لیا۔ یعنی دو شیشے کی دو تین۔ دو چاقوئیں  
 قلم۔ ایک ناخن ہیں اور دو بیگ وغیرہ خریدے گئے۔ کیا بتاؤں، ان نئی نئی چلتی ہوئی چیزوں کے  
 متعلق یہ سمجھ کر کہ یہ سب اب ہمیں لگی دل کس قدر خوش ہوا!

تعلیم کے لئے علی گڑھ روانگی | جب بڑے دن کی تپیل ختم ہونے کو ہوئی تو والد ہم دونوں  
 بھائیوں کو علی گڑھ لے گئے۔ اور معمولاً سید صاحب کے ہاں قیام کیا۔ سید صاحب ہم  
 دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے دفتر کے قریب ایک بڑا کمرہ ہمارے رہنے کے  
 لئے تجویز کیا اور اسی میں ہمارا سامان لگا دیا گیا۔ اس کمرے میں سید محمد علی جو سید صاحب کے  
 حقیقی بھائی کے حقیقی نواسے تھے، رہا کرتے تھے۔ اب ان کو کوٹھی کے احاطے میں جو چھوٹا سا بنگلہ  
 تھارہنے کو دیا گیا۔ اور ہم کو ان کا کمرہ ملا۔ بورڈنگ ہاؤس میں سید صاحب نے ابھی ہم کو نہیں  
 بھیجا۔ اپنے ہی قریب رکھا۔ والد ایک دن قیام کر کے اللہ آباد چلے گئے اور مجھ کو چند نصیحتیں ایسی  
 کر کے جو اس وقت تو سمجھ میں نہ آئی تھیں مگر اب بڑھاپے میں یاد آ کر کرتی ہیں۔

سکول میں داخلہ | دوسری یا تیسری جنوری ۱۸۸۱ء کو ہم دونوں بھائی کالج کے سکول میں  
 داخل ہوئے۔ نسبت صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ سید محمد علی جن کی عمر اس وقت ۱۸ برس کی تھی  
 ہم کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ایک بڑے جڑبڑ میں جس کے کاغذینے رنگ کے  
 تھے ہم دونوں بھائیوں کے نام لکھ لئے گئے۔ مجھے ڈل کلاس میں شامل کیا گیا۔

علی گڑھ میں تعلیم | درحقیقت علی گڑھ میں داخلہ کے بعد ہی آپ کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ  
 شروع ہوا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۸۵ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۸۸۵ء میں ایف اے  
 ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں بی اے کا امتحان دیا۔ لیکن چونکہ اس دوران میں بہت دنوں تک سخت بیمار  
 رہے تھے۔ لہذا پورے اچھے نہ ہوئے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ کامیاب نہ ہو سکے۔ دوبارہ امتحان دیا اور اپریل ۱۸۸۶ء

میں بی، اے ہو گئے۔ انٹرنس اور ایف، اے کے امتحان کلکتہ یونیورسٹی کے دیے تھے کیونکہ عملی لکھنے اُس وقت کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ بی ماے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی کا دینا پڑا۔ اور اس میں گزرتی فلسفہ اور ریاضی آپ کے مضامین تھے۔

بی، اے ہو جانے کے بعد آپ ایم، اے کی کلاس میں داخل ہو گئے۔ اور ایل، ایل، بی کے لکچر میں بھی شامل ہوتے رہے۔ مگر شدید اور مسلسل بیماری کے باعث دونوں چیزیں چھوڑنی پڑیں۔ اور مجبوری کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں دہلی چلے آئے۔

سرسید کی محبت و شفقت  
چونکہ شمس العلماء مولانا ذکار اللہ سرسید مرحوم کے خاص دوستوں میں سے تھے اور عنایت اللہ علاوہ نہایت ہونہار۔ شریف الطبع اور فرمانبردار دوست ہونے کے شمس العلماء مولانا ذکار اللہ کے لڑکے تھے۔ لہذا اسکول اور کالج کے تمام زمانہ تعلیم میں سرسید اُن کی تعلیم و تربیت اور بالخصوص صحت جسمانی کا خاص طور پر بہت ہی اہتمام کے ساتھ خیال رکھتے تھے جب کبھی یہ بیمار ہو جاتے، بس یہ سمجھو کہ غضب آجاتا۔ سید صاحب اطلاع ملتے ہی انھیں کوٹھی پر لپٹنے پاس بلا لیتے تھے۔ اور وہاں ان سے اتنا سخت پریز کر اتے کہ خدا کی پناہ۔ جان آفت میں آجاتی۔ مگر ان کی کیا مجال تھی جو انکار کر سکتے۔ ایک مرتبہ اسی طرح انھیں کوٹھی پر بلا لیا۔ اور خاناں کو حکم دیا کہ ”ایک چوزے کا شوربا اور تین پھلکے عنایت اللہ کو دونوں وقت دیا کرو۔ اور کچھ کھانے کو مت دو“ شوربا تیار ہونے کے بعد سید صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔ جب وہ ایک چمچہ خود پی کر اُسے پاس کہتے تو پھر مولوی عنایت اللہ کو ملتا تھا۔ غرض پندرہ دن تک سولے اس کے کچھ کھانے کو نہ ملا۔ ظاہر ہے کہ ایک جوان آدمی سارا دن صرف تین پھلکوں پر کس طرح گزارا کر سکتا ہے۔ سخت جان مصیبت میں آئی۔ بھوک کے مارے بڑا حال ہوتا۔ مگر تہر درویش برجان درویش۔ کرتے کیا؟ ایک روز جب بھوک سے بے حد بے چین ہوئے تو بڑی جرأت سے کام لے کر انھوں نے ڈرتے ڈرتے سید صاحب سے کہہ ہی دیا کہ ”اب میں بالکل اچھا ہو گیا ہوں۔ پریزیری کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ارشاد فرمائیں تو معمولی کھانا کھانے لگوں“ مگر سید کا یہ جواب سُن کر مولوی عنایت اللہ کی مایوسی کی حد نہ رہی کہ ”ابھی تین دن اور پریز کر دو۔ پھر معمولی غذا ملے گی“ کچھ نہ پوچھنے کہ یہ تین دن کس مصیبت سے گزرے؟ تین دن تین برس ہو گئے اور خدا خدا کر کے اس قید سے رہائی پائی۔

سر سید کو عنایت اللہ سے اپنے بچوں جیسی محبت تھی۔ اور یہ شفقت اور محبت مرتے دم تک قائم رہی۔ جو خطوط مختلف اوقات میں سر سید نے انھیں لکھے ہیں۔ یا ان کے متعلق ان کے والد کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے محبت اور اُلفت پکی پڑتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کو ان سے محبت نہیں عیش تھا۔ کبھی ذرا بھی ان کی طبیعت علیل ہو جاتی تو سر سید نہایت درجہ بے چین اور مضطرب ہو جاتے۔ اور ان کو اُس وقت تک چین نہ آتا جب تک خیریت کا خط نہ آجاتا۔ مثال کے طور پر ہم یہاں مولوی صاحب کے متعلق سر سید کے چند خطوط کے ضروری اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے اُس نہایت گہرے تعلق پر کافی روشنی پڑتی ہے جو سر سید کو مولوی عنایت اللہ سے تھا۔

مولوی عنایت اللہ صاحب نے وہ خطوط جو سر سید نے وقتاً فوقتاً انھیں لکھے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک جلد میں مجلد کر رکھے ہیں۔ اس مجموعہ میں بعض وہ خطوط بھی ہیں جو سر سید نے ان کے والد کو لکھے ہیں۔ یہ اقتباسات اسی نایاب قلمی مجموعہ میں سے لئے گئے ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۸۹۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

عزیزی عنایت اللہ !

تھارا خط پہنچا۔ تمھاری صحت سے نہایت خوشی اور طمانیت ہوئی۔ تمھاری علالت سے مجھ کو نہایت رنج تھا۔ اپنی والدہ صاحبہ سے میرا بہت بہت سلام کہنا۔ اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ بلاشبہ ماں سے زیادہ کسی کو عنایت اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھ کو بھی عنایت اللہ سے کچھ کم محبت نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تم کو صرف محبت ہی محبت ہے۔ اور میری محبت میں کچھ غفل کا بھی میل ہے۔ تمھاری محبت خالص ہے۔ میری محبت میں ملاوٹ بھی ہے، خیر خدائے کو صحیح و تند درست رکھے۔ والسلام۔

۱۸۹۲ء کے خط میں مولوی عنایت اللہ صاحب نے نہایت بہرمانی انداز میں خط لکھا کہ یہ مجموعہ ڈیرہ دون سے مجھے بھیج دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں عنقریب نہایت نفاست کے ساتھ اسے شائع کروں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ خطوط کی نقلیں شائع نہ کی جائیں بلکہ ہر خط کا عکس لے کر اسے اصلی حالت میں شائع کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں سر سید کے خط کی اہلی شان کو دیکھ سکیں۔ (اسماعیل)

۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کا خط ہے:-

عزیزی محمد عنایت اللہ!

تم کو کچھ یہ بھی خیال ہے کہ تمھاری صحت کا کسی اور کو بھی خیال و فکر رہتا ہے یا نہیں؛ غدر کے بعد سے دلی کے رہنے والوں کی قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ اور بے مروتی چھا گئی ہے تم بھی سب سے اول درجہ کے بے مروت ہو گئے ہو۔ یہ تو مجھے یقین ہے۔ مگر تمھاری صحت کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ اپنی صحت سے مطلع کرو۔

شمس العلماء مولانا ذکار اللہ کو ۱۶ مئی ۱۸۹۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

”..... تم سے میں اس لئے ناراض ہوا کہ باوجود اس قدر بیماری کے جو دہلی میں ہوئی آپ نے اور آپ کی خدا رسیدہ بیوی صاحبہ نے عنایت اللہ کو دہلی میں رہنے دیا۔ متعدد دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو لکھوں کہ عنایت اللہ کو دہلی سے صحیح دو۔ پھر معلوم نہیں کیا کیا اوہم اور خیالات نے گیرا کہ خط لکھا لکھایا چاک کر دیا۔ اور دل کو اس بات سے تقویت دی کہ خرابی تو کل کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ خیر و عافیت سے وہ سخت زمانہ گزر گیا۔ مجھ کو تو دن رات تردد رہتا تھا.....“

۴ دسمبر ۱۸۹۲ء کا خط خاصا پر لطف ہے:-

عزیزی محمد عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ اس سے مجھے بہت زیادہ خوشی اس خیال سے ہوئی کہ تمھاری طبیعت بہت اچھی ہے۔ اب ضرور تمھاری والدہ صاحبہ تمھارا بیاہ کر دیں گی لیکن جب بیاہ کا یہ مقام ہو تو کہہ دینا کہ پہلے دکھا دو۔ بے دیکھے نہیں کر سکتا۔ تمھاری صحت سے مجھے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ خدا تمھیں صحیح و تندرست رکھے۔ آمین!

۳۱ جنوری ۱۸۹۵ء کے خط کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

عزیزی عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ تمھاری علالت مزاج کا درحقیقت مجھ کو نہایت رنج ہے۔ جو خیالات کہ تم نے

۱۵ اپریل ۱۸۹۲ء میں دہلی میں ہیضہ کی وبا نہایت شدت سے پھیل چکی تھی۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔

اپنے خط میں ظاہر کرتے ہیں وہ لغو ہیں۔ اگرچہ فی نفسہ تمھاری ذاتی خوبیوں پر دلالت کرتے ہیں لیکن میں نے ان کو لغو اس لئے کہا کہ میرا تمھارا جو واسطہ ہے اس میں ایسے خیالات لغو ہیں میں تم کو مثل اپنے بچے کے سمجھتا ہوں۔ پس ایسی حالت میں اس قسم کے خیالات لغو ہیں.....“

۱۸ جولائی ۱۹۰۶ء کے خط کے بعض فقرے ملاحظہ ہوں:-

”عزیزی عنایت اللہ!

تمھارا خط پہنچا۔ شکر خدا کہ مدت بعد تم کو خدا نے توفیق خط لکھنے کی دی۔ تمھارے ہمیشہ بیمار رہنے سے جس قدر بچہ کو بچ ہے، شاید تمھارے ماں باپ کو بھی اس سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر تقدیری امور میں کسی کو کچھ چارہ نہیں ہے۔ نہ تمھارے ماں باپ کچھ کر سکتے ہیں نہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ بہر حال ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ خدا تعالیٰ تم کو صحیح اور تندرست رکھے.....“

مولوی صاحب کا تعلیمی

مولوی عنایت اللہ صاحب کا تعلیمی عرصہ خاصا نمایاں حیثیت میں گذرا

زمانہ اور علمی قابلیت

اور وہ ایم، اے، او کالج کے ہشیاں اور قابل طالب علموں میں سے سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے تعلیم کے دوران میں دو مرتبہ انعام حاصل کیا۔ اور چار مرتبہ وظیفہ پایا بی، اے، ریاضی اور فلسفہ میں کیا جو دونوں مشکل اور مشک مضمون ہیں۔ نہایت صاف سلیس اور شستہ ترجمہ کرنے کی حیرت انگیز قابلیت تو آپ کو ورثہ میں ہی ملی تھی۔ ابھی آپ فورٹھ ایر کلاس ہی میں تھے کہ انگریزی مضامین اور نظموں کا بہت عمدہ ترجمہ کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے کئی بھٹے ترجموں میں سے گرسے کی مشہور و معروف نظم ”ایلیجی“ کا ان میں ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اسی سے زمانہ طالب علمی میں آپ کی لیاقت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کی

اس تعلیمی امتیاز اور علمی قابلیت کی وجہ شروع میں آپ کے والد ماجد کی

علمی قابلیت کے اسباب

نگرانی اور تربیت اور زانی بابر سیرت مرحوم کی عنایت و شفقت تھی جو ان کی تعلیم اور صحت کا سچا خیال رکھتے تھے۔ اور اپنے بچوں کی مانند ان سے برتاؤ کرتے تھے۔ اور اسکی نتیجہ تھا کہ مولوی صاحب بچپن ہی سے نہایت سعادت مند۔ صالح۔ نیک طبیعت۔ اطاعت شعار اور صفائی پسند تھے۔

مولوی صاحب کے اساتذہ اور پرفیسر

مولوی صاحب نے سکول میں جن استادوں سے تعلیم پائی ان

کے نام ماسٹر بننا اور لعل۔ ماسٹر چکرورتی۔ ماسٹر نسبت اور ماسٹر ہوسٹ تھے۔ جب کالج میں پہنچے تو حسب ذیل اساتذہ سے آپ کو استفادہ کا موقع ملا۔ ماسٹر تھیوڈور بک۔ پرنسپل مدرستہ العلوم۔ سر طاس آرنلڈ (مولف پبکینگ آف اسلام) سروالٹر اے۔ ریلے۔ بیرلڈ کاکس۔ ماسٹر ولس (ہیلٹ لٹھری سے پڑھی) ماسٹر جادہب چند چکرورتی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ شمس العلماء بیولوی سید عباس حسین۔ شمس العلماء سید امجد علی وغیرہ۔

ان کے علاوہ ۱۸۵۵ء میں جسٹس سید محمود مرحوم سے بھی انگریزی کی بعض نظمیوں پڑھی تھیں، اور ۱۸۸۸ء میں جسٹس سر محمد رفیق مرحوم سے فلسفہ اور نفسیات پر کچھ لکچر سنے جو ان دنوں مدرستہ العلوم کے اعزازی پروفیسر تھے۔

کالج کی زندگی میں مولوی عنایت اللہ کے سخت نگران اور نہایت شفیق اتالیق سر سید امجد خاں مرحوم تھے۔

مولوی صاحب کی قابلیت اور | جب ایسے لائق اور فاضل اساتذہ پڑھانے والے ہوں اور ایسا  
بیانت کا اعتراف میرتد کی زبان سے شفیق اور بزرگ اتالیق ہو تو ظاہر ہے کہ سعادتمند اور نیک اطوار

طالب علم کس قدر زیادہ لائق اور قابل بن سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مولوی عنایت اللہ نے اپنے قابل فخر اساتذہ کی تعلیم اور صحبت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ہندوؤں کے چوٹی کے ادیب۔ بہترین مصنف اور اردو زبان کے سب سے زیادہ کامیاب مترجم ہیں۔ بعد کے زمانے میں جو بے نظیر اور محققانہ کتابیں مولوی صاحب نے تالیف و ترجمہ کیں یہ سب سر سید مرحوم کی تربیت کا اثر اور اپنے فاضل پروفیسروں کی تعلیم کا نتیجہ تھیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ان کی بیانت کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ اور بی، اے پاس کرنے کے بعد تو ان کی علمی قابلیت اور ادبی بیانت کا اعتراف بارہا سر سید مرحوم نے بھی کیا ہے۔ سر سید مرحوم کی دور میں نگاہیں ان کو ایک نہایت جوہر قابل دیکھ رہی تھیں اور درحقیقت وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے۔ اسی وجہ سے سر سید کو ان سے بے حد تعلق اور لگاؤ تھا۔ اور وہ ہر وقت ان کی ترقی و بہبودی اور سب سے بڑھ کر ان کی صحت و تندرستی کی فکر میں رہا کرتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ نے بی۔ اے ہونے کے بعد دہلی میں ملٹیٹر کر سر سید کے فرمانے پر ایوکیان

البیرونی کی ایک بہت مختصر سوانح عمری لکھی تو اُس کے ٹائٹل پیج کے متعلق سر سید اپنے خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۹۲ء میں انھیں لکھتے ہیں :-

”..... تمہارے نام کے ساتھ مدرستہ العلوم کا نام رہنا بلاشبہ تمہاری خوشی کا باعث ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں تمہارے نام کے ساتھ کالج کا نام رہنا کالج کی عزت کا باعث ہے۔ اگر کالج کے بچے ایسے ہوں جیسے تم ہو۔ تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ کالج کو اُس سے فخر و اعزاز نہ ہوگا پس میں نے ٹائٹل پیج میں تمہارے نام کے ساتھ کالج کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔ اسی طرح ٹائٹل پیج چھپواؤ۔ اور انگریزی زندگی ہے اور خدا نے بھی چاہا تو قبل لفظ ”آف“ کے لفظ ”فیلو“ بھی تمہارے نام کے ساتھ بڑھایا جائے گا.....“

جب بیرونی کی مختصر لائف لکھ کر مولوی عنایت اللہ نے سر سید مرحوم کو بھیجی تو اُس کی رسید دیتے ہوئے سر سید اپنے خط مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۹۳ء میں لکھتے ہیں :-

”..... رسالہ رسالہ پہنچا۔ میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا۔ جس خوبی اور عمدگی سے تم نے اسے لکھا ہے، وہ محتاج تعریف نہیں۔ میرا دل نہایت خوش ہوا کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تالیف کی بھیجی اس قدر لیاقت دی ہے۔ جس پر میں اور تمہاری مال اور باپ دونوں شکر کرنے پر آمادہ ہیں.....“

ایرسن کے مضمون ”مکانات“ کے ترجمہ کے متعلق ۱۴ جون ۱۸۹۵ء کے خط میں رقمطراز ہیں :-

”نہایت عمدہ مضمون اور نہایت عمدہ اور بے مثل ترجمہ پہنچا۔ بجنسہ و بتامہ ”تہذیب“ میں چھاپا ہوگا۔ تمہارا نہایت دل سے شکر یہ ادا کرتا ہوں“

اسی مضمون کے متعلق ۹ جولائی ۱۸۹۵ء کے خط میں اپنے دوست اور مولوی عنایت اللہ کے والد شمس العلماء مولانا ذکار اللہ کو تحریر فرماتے ہیں :-

”..... اب کے ”تہذیب الاخلاق“ میں عزیز عنایت اللہ کا ایک مضمون انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہوا چھپا ہے۔ آپ انصاف سے اُس کو پڑھیے گا۔ آپ کی تمام عمر ترجمہ کرنے میں گذر گئی۔ کیا آپ بھی ایسا عمدہ ترجمہ کر سکتے ہیں؟ اگر کسی ایسے مطلق اور مثل مضمون کا اردو میں ایسا ترجمہ کر دو تو جو کچھ کہو آپ کی نذر کروں“

سر سید اپنے ۲ فروری ۱۸۹۷ء کے خط میں جو مولوی عنایت اللہ کے نام ہے، لکھتے ہیں:-  
 ”..... میں یقین کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ عمدہ اُردو دیکھتے ہو۔ تم تو دلی کے رہنے  
 والے ہو۔ اور میں علی گڑھ کا رہنے والا۔ اور دلی چھوڑے ہوئے مجھے دو جگہ سے زیادہ ہونگے“  
 جب سر سید کی فرمائش سے مولوی عنایت اللہ نے آزلٹ کی کتاب پر چنگ آف اسلام کا اُردو  
 ترجمہ شروع کیا۔ اور شروع کے چند صفحات ترجمہ کر کے سر سید کو بھیجے تو اس کے جواب میں سر سید  
 اپنے ۱۵ فروری ۱۸۹۷ء کے خط میں مولوی عنایت اللہ کو لکھتے ہیں:-

” تمہارے مسدود ترجمہ کو میں نے دو دفعہ پڑھا۔ اور نہایت ہی دل خوش ہوا۔ اگر تمہارا  
 والد ماجد نے بھی یہ ترجمہ دیکھا ہے تو وہ بھی خوش ہوئے ہوں گے۔ مگر تم کو یقین ہو گا کہ تمہاری  
 لیاقت اور سعادت مندی سے میں تمہارے والد ماجد سے بھی زیادہ خوش ہونے والا ہوں  
 ..... تم نے ایسا کام کیا ہے جس کی نظیر آج تک اُردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی....“

زمانہ قیام دہلی کے مشاغل | ہم اور پریشان کر چکے ہیں کہ مولوی عنایت اللہ ایم۔ اے۔ اور ایل۔ ایل۔  
 بی میں پڑھ رہے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ اور اس سلسلہ کو ترک کر کے ۱۸۹۲ء میں دہلی  
 آنا پڑا۔ دہلی آنے کے بعد بیماری کی حالت میں بھی مولوی عنایت اللہ بیکار نہیں بیٹھے۔ بلکہ  
 جہاں تک صحت اجازت دیتی برابر اور مسلسل تصنیف و تالیف اور ترجمہ میں مصروف رہتے۔ کبھی  
 کبھی سر سید کسی کام کو علی گڑھ بلا لیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ کوئی مضمون یا سٹریک یا مسٹر مارلین  
 کی بعض انگریزی تحریریں ترجمہ کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔

کالج کے لائبریرین اور پروفیسر | ۱۸۹۳ء میں سر سید نے آپ کو کالج کی لائبریری کا انتظام سپرد  
 کیا۔ جسے کچھ عرصہ تک آپ نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ بعد ازاں چند دن آپ کالج میں ریاضی  
 کے اعزازی پروفیسر رہے۔ پھر واپس دہلی چلے گئے۔

تہذیب الاخلاق کی ادارت | مولوی صاحب دہلی میں تھے کہ سر سید نے سوال ۱۳۱۱  
 تیسری مرتبہ رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ کو جاری کرنا چاہا۔ اور مولوی عنایت اللہ کو اس کا  
 سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ ۱۸۹۵ء ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور مولوی صاحب اپریل ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ  
 پہنچ گئے۔ اور کچھ کم ایک سال تک بہت تابلیت اور لیاقت کے ساتھ ”تہذیب الاخلاق“ کی

سب ایڈٹری کرتے رہے۔ اس زمانے میں اکثر اعلیٰ پایہ کے مضامین سرسید کی فرمائش پر آپ نے انگریزی سے ترجمہ کر کے تہذیب الاخلاق میں شائع کئے۔

۱۸۹۵ء کا سال علی گڑھ کالج اور سرسید کے لئے نہایت منجوس تھا کالج کا بنی اور مولوی صاحب کی دفتر کو از سر نو مرتب کرنا شیام بہاری لال کالج کے ہیڈ کلرک نے ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے کا بن کیا۔ اور گرفتار ہونے کے بعد قید خانہ میں کچھ کھا کر مر گیا۔ اس نے دفتر کو عمداً رڈی کی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ اس کی دوبارہ ترتیب کے لئے سرسید نے دہلی سے مولوی عنایت اللہ کو بلوایا۔ چنانچہ وہ اپنے ۱۸ جولائی ۱۸۹۶ء کے خط میں مولوی صاحب کو لکھتے ہیں:-

”..... شیام بہاری لال تنوینی نے جو کاغذات اور جبرہ دفتر انگریزی کے چڑائے۔ اور نیز چھٹیاں دفتری چڑائیں اس سے دفتر بالکل الٹ پلٹ ہو گیا۔ اور نیز اس نے دانستہ دفتر کو ایسی حالت میں ڈال رکھا تھا۔ جیسے کہ ایک رڈی کا ڈھیر۔ بہر حال جس قدر دفتر موجود ہے اس کی از سر نو ترتیب کرنی ضرور ہوئی ہے۔ چنانچہ چھٹیاں موجودہ کو بترتیب درست کر لیا ہے اب صرف ان کا نئے جبرہوں میں چڑھانا باقی ہے۔ اس کام میں میں تمھاری مدد چاہتا ہوں بشرطیکہ تمھاری طبیعت بصحت کامل ہو۔ اور جب بحالت صحت تمھارا یہاں آئے گا ارادہ ہو تو دو ہفتہ کے قریب تم کو کام کرنا ہو گا۔ لیکن یہی شرط ہے کہ تمھاری طبیعت بالکل صحیح اور تندرست ہو۔ پس جب تمھاری طبیعت درست ہو جائے تو چند روز کے لئے یہاں آ جانا“

اس حکم کی تعمیل میں مولوی صاحب علی گڑھ گئے۔ اس کام میں سرسید کی امداد کرنے کے علاوہ دفتر کا معمولی کام بھی انجام دیتے رہے۔

۱۸۹۷ء کا تقریباً تمام سال مولوی عنایت اللہ نے بہت مصروفیت کا کاٹا اور سرسید کا انتقال اور اس دوران میں انھوں نے بقول سرسید ”ایسا کام کیا جس کی نظیر آج تک اردو لٹریچر میں نہیں مل سکتی“ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر کتاب ”پریچنگ آف اسلام“ کا اردو ترجمہ تھا۔ جو آپ نے سرسید کے ارشاد اور حکم سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے کیا تھا۔

اس ہتم با نشان اور بے نظیر کتاب کا ترجمہ آپ نے جنوری ۱۸۹۷ء میں شروع کیا۔ اور

اسی سال کے ماہ نومبر میں اُسے ختم کر دیا۔ درمیان میں چند ماہ کے لئے سرسید صاحب نے آپ کی علمی گلدستہ بلا لیا تھا۔ علمی گلدستہ کے اس زمانہ قیام میں اگرچہ ترجمہ کا کام تو بند رہا مگر ایک نہایت مفید کام یہ ہو گیا کہ سرسید نے ترجمہ کے شروع کے پانچ باب بہت غور اور توجہ سے سُن لئے اور اس میں کہیں کہیں ضروری ترمیم بھی کر دی۔ سرسید کے ترجمہ سننے کا طریقہ یہ تھا کہ مسودہ اپنے سامنے رکھ لیتے اور مولوی عنایت اللہ سے پڑھنے کو کہتے۔ مولوی عنایت اللہ کو سرسید کے اس قدر قریب بیٹھنا پڑتا کہ پنکھے کی ہوا سے سرسید کی ڈاڑھی کے جوباں اُڑتے وہ مولوی عنایت اللہ کی گردن پر لگتے اور اُن سے بڑی گدگدی پیدا ہوتی۔ مگر غیب کیا کرتے چپ بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک طرف یہ ہوتے دوسری طرف سرسید کے لٹری اسٹنٹ مولوی سید وحید الدین تسلیم مرحوم کُرسی پر بیٹھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ اگر کتاب میں کوئی بات اسلام کے خلاف معلوم ہو تو لوگوں سے سرسید صاحب ترجمہ سننے کے لئے بیٹھے تو قلم میں ڈوبائے کرتا رہتا اور کہتے ”پڑھو“ مولوی عنایت اللہ حسب الارشاد پڑھنا شروع کرتے۔ اگر پڑھنے میں ذرا بھی کہیں اٹکتے تو سرسید صاحب سمجھتے کہ اس نے غلطی کی۔ فوراً ٹوکتے اور کہتے ”بے وقوف سمجھے نہیں“ مولوی عنایت اللہ کہتے ”جی نہیں ترجمہ تو ٹھیک ہے۔“ اس پر دوبارہ ترجمہ پڑھواتے اور پھر فرماتے کہ ”اچھا آگے چلو۔“ کہیں کہیں اگر کسی فقرے میں ترمیم کرتے تھے یا کوئی لفظ بناتے تھے تو گویا ترجمہ میں چارچاند لگ جاتے تھے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ فقرہ میں کوئی لفظ آگے چل کر کچھ ہل سا ہو جاتا تو سوچنے لگتے۔ مولوی عنایت اللہ چونکہ فقرے کو کئی طرح سے ترجمہ کر چکے ہوتے تھے لہذا عرض کرتے کہ اس فقرہ کو یوں بنا دیجئے۔ فوراً اسی طرح بنا دیتے اور مترجم کی بیٹھ بٹھو نکلتے اور فرماتے ”آخر کس کا بیٹھا ہے۔“ مولوی وحید الدین تسلیم کُرسی پر بیٹھے بہت غور سے ترجمہ سنا کرتے۔ مگر اعتراض بہت کم کرتے۔ ایک مرتبہ ترجمہ سن کر باہر نکلے تو مولوی عنایت اللہ سے کہنے لگے ”میں تو بڑی حیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کس قدر صاف اور سلیس ترجمہ کرتے ہو۔“

مکمل ہو جانے کے بعد سرسید نے دسمبر ۱۸۹۷ء میں یہ ترجمہ مفید عام پریس آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ لیکن ابھی کتاب مطبع سے چھپ کر نہیں آئی تھی کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا۔ اور مولوی عنایت اللہ اپنے ایک نہایت ہی بزرگ شفیق کی عنایتوں

سے محروم ہو گئے۔

یہ کتاب سرسید نے بڑے شوق سے ترجمہ کرائی تھی۔ اور اس کی اشاعت کے متعلق اُن کے بڑے بڑے ارادے تھے۔ مگر افسوس! موت نے سب ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

مولوی صاحب کی نصیحت سرسید کے انتقال کے بعد مولوی عنایت اللہ بالعموم گھر ہی پر رہے۔ لیکن اس دوران میں ترجمہ اور تالیف کا کچھ نہ کچھ کام کرتے

ہی رہے۔ چنانچہ انگریزی نظریات قانون کا ترجمہ "مسٹر مورلین کی" اسپیریل رول ان انڈیا کے بعض ابواب کا ترجمہ "پبلنگ کی جنگل بک" کی دو کہانیوں کا ترجمہ "خواب پریشاں" کی تصنیف۔ ان کے علاوہ بعض انگریزی نظموں کے تراجم اور بعض تاریخی مسالوں کے ترجمے اس زمانے میں کیئے جو بعد میں مختلف اوقات میں چھپے۔

اسی زمانے میں سقراط کے حالات جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور مختلف کتابوں سے اخذ کر کے اس کی مفصل سوانح عمری مرتب کی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سارا مسودہ کہیں ایسا گم ہوا کہ آج تک نہ ملا۔

جون پور کی ملازمت ۱۹۰۷ء سے آپ کی باقاعدہ اور مسلسل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جون پور کی منبری پر مقرر ہوئے۔ (اُس زمانہ میں دفتر کے چیف سپرنٹنڈنٹ کو منصرم کہتے تھے) ۱۹۰۷ء کو آپ نے اس فترت دارا عہدہ کا چارج لیا۔ آپ کی ابتدائی تنخواہ دو سو روپے ماہوار تھی۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۷ء تک آپ جون پور ہی میں رہے۔ ملازمت کے فرائض کی بجائے اوری کے ساتھ تصنیفی شغل بھی برابر جاری رہا۔ جس کا چسکا سرسید مرحوم لگائے تھے۔ اس زمانہ میں آپ اُس بے نظیر لا جواب اور محققانہ تالیف کا مواد فراہم کرتے رہے جس کی ابتدا ۱۸۹۶ء سے ہوئی تھی اور جو بعد میں "انڈس کا تاریخی جزافیہ" کے نام سے شائع ہوئی۔

بریلی کا تبادلہ ۱۹۱۲ء میں آپ کا تبادلہ جون پور سے بریلی کا ہو گیا۔ مگر بریلی میں آپ صرف ۹

رہے۔

ریاست گواہیار کی لوگری | بریلی کی ملازمت کے دوران میں صاحبزادہ سلطان احمد خان فیاض مہر

کی سفارش پر ریاست گوالیار نے آپ کی خدمات گورنمنٹ سے مستعار لے لیں۔ اور آپ انڈر سکریٹری فینانس مقرر ہو کر جنوبی حصہ ۱۹۱۷ء میں گوالیار تشریف لے گئے۔ جہاں بعد میں سکریٹری ایسٹ ڈپارٹمنٹ کا عہدہ آپ کو تفویض کر دیا گیا۔ گوالیار میں آپ چھ برس رہے۔

گوالیار کی ملازمت اگرچہ بہت عظیم المرتبتی کی نوکری تھی۔ مگر فرائض کی ادائیگی سے جس قدر وقت بچتا وہ آپ عملی خدمت میں بسر کرتے۔ اُس زمانہ کی یادگار پیرکٹ ایئر - قسطنطنیہ - اور گریک اسپیریلزم - تین کتابیں ہیں جو آپ نے دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے معاوضہ ترجمہ کیں۔ انڈس کے تاریخی جزافیہ کے متعلق بھی اس دوران میں کچھ نہ کچھ کام آپ کرتے رہے۔ ڈوڑی کا ترجمہ جو جوینپور میں شروع کر دیا تھا یہاں آکر بھی جاری رہا۔

دارالترجمہ حیدرآباد | جب حیدرآباد میں ایک عظیم الشان تعلیمی انقلاب آیا اور اعلیٰ حضرت شاہ کی نظامت دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی اوالغزبی اور قیاضی کی بدولت وہاں اُس مبارک

یونیورسٹی کی بنیاد پڑی جس میں تمام مضامین ہندوستان کی متحدہ قومی اور ملی زبان میں پڑھانے قرار پائے تو اس کے لئے ایک دارالترجمہ کا قیام ضروری ہوا۔ تاکہ غیر زبانوں سے بہترین اور ضروری کتابیں جامعہ عثمانیہ کے لئے اردو میں منتقل کی جائیں۔ اہل ترجمہ کی نظامت اعلیٰ کے لئے ایسے بل ایب کی ضرورت ہوئی جو فن ترجمہ کا ماہر اور اس بحر ناپید الکنار کا پورا پورا خواص ہو۔ کارکنان کو مولوی عنایت اللہ سے بہتر اس خدمت کے لئے دوسرا شخص نہ ملا۔ چنانچہ سر اس مسعود مرحوم اور سر اکبر حیدری کی کوشش سے گوالیار سے آپ کی ملازمت بواسطہ سرکار انگریزی اعلیٰ حضرت حضور نظام کی گورنمنٹ کے لئے منتقل کر لی گئی اور آپ نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد پہنچ کر نظامت دارالترجمہ کا چارج لے لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسران اعلیٰ نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ مولوی صاحب سے بہتر اس کام کے لئے ہندوستان بھر میں کوئی اور موزوں شخص نہ تھا۔ سازشوں - جوڑتور - اور ریشہ دوانیوں سے بالکل الگ تھلک - اور اس قسم کے ہر ایک کام سے کامل طور پر بے خبر اور نابلد - ہر وقت اور ہر آن علمی مضمون اور ادبی اشغال میں مصروف و مہنگ رہنے والا انسان ہی اس بات کا جائز حقدار تھا کہ دارالترجمہ کی کرسی نظامت پر تمکن ہو۔ چنانچہ حق بہ حقدار رسید - مولوی صاحب نے جس عمدگی - خوبی اور لیاقت و قابلیت کے ساتھ ناظم دارالترجمہ کی حیثیت میں اپنے اعلیٰ اور نازک اور ذمہ دارانہ فرائض کو

انجام دیا وہ صرف اٹھنی کا حصہ تھا۔ تقریباً تین سو کتابیں ان کے زمانہ نظامت میں دارالترجمہ سے غیر زبانوں کی ترجمہ ہوئیں۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ مختلف علوم و فنون کا اردو میں منتقل ہو گیا۔ لٹریچر کی اس بے نظیر خدمت کے لئے دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ کا نام اردو ادب کی تاریخ میں یقیناً آب زر سے لکھا جائے گا۔ اور آنے والی نسلیں اردو زبان کے اس محسن پر بخیر کریں گی۔

حیدرآباد میں شروع میں آپ کی تنخواہ ۵۰۰ روپے ماہوار تھی جو بعد میں ساڑھے ساتھی ہو گئی۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں سرکار انگریزی کی ملازمت سے آپ کی پنشن ہو گئی تو اس کے بعد آپ خالص نظام سروس میں آ گئے۔ اور باقاعدہ پچاس روپے سالانہ ترقی ملنے لگی۔ یہاں تک کہ تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار ہو گئی۔ جو اس عہدہ کی آخری تنخواہ ہے۔ ایک ہزار روپے ماہوار آپ نے تین سال تک لئے۔ مگر ان سوس ہے کہ آخری زمانہ ان کا حیدرآباد میں بہت بے لطف گناہروقت اس انتظار میں رہتے کہ کب ان کی جگہ کا انتظام ہو۔ اور وہ اپنے گھر جائیں تقریباً ۳۴ برس ملازمت کے ہو چکے تھے۔

فرائض کی سجا آوری کے علاوہ نظامت دارالترجمہ کے دوران میں آپ پرائیویٹ طور پر بھی علمی خدمت کتے رہے۔ چنانچہ تالیس۔ چھاسمر۔ تیمور اور چنگیز خاں وغیرہ کتابیں اُسوقت لکھیں اور شائع کرائیں۔ اندلس کے تاریخی جغرافیہ کو ختم کیا۔ ڈوری کی تکمیل کی۔ پاسکل دی گیائکوس کی تاریخ مقبری کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ جو گوا ایار میں شروع کیا تھا یہاں بھی کچھ کیا۔ ہوروتھ کی تاریخ منغل کا ترجمہ شروع کیا۔

حیدرآباد سے واپسی | ناظم دارالترجمہ کے عہدے پر آپ ۱۴ سال سات دن فائزرہے۔ آخر کار نومبر ۱۹۳۷ء میں تین ماہ کی رحمت بیماری لے کر حیدرآباد سے چلے آئے۔ اور قصد کر لیا کہ اب حیدرآباد کی ملازمت نہ کریں گے۔ فروری ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد میں نظامت کا انتظام ہو گیا۔ اور اس طرح مولوی صاحب کو حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوئی۔

ڈیرہ دون میں قیام | حیدرآباد سے آنے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ آپ اپنے وطن وہلی میں قیام کرتے۔ مگر آپ نے، بچند جو ہات ڈیرہ دون کو اپنے رہنے کے لئے پسند فرمایا۔ جہاں کی آب و ہوا

بھی عمدہ ہے اور گرمی بھی کم پڑتی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں علمی خدمت کرنے والے شخص کے لئے نہایت قیمت ہیں۔ ڈیرہ دون میں بنی روڈ پر ۱۹۳۲ء میں آپ نے ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید لیا تھا اب وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس ضمنی میں بھی برابر علمی خدمت میں مصروف ہیں: اتنی طویل اور تھکا دینے والی ملازمت اور پھر ضعیفی و کمزوری کا نتیجہ تو یہ تھا کہ آخر عمر میں آپ کامل طور پر آرام کرتے اور بالکل فارغ ہو بیٹھ جاتے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک آنکھ میں غبار رہنے، نہایت ضعیف ہو جانے، اکثر بیمار رہنے اور حافظہ کے کمزور ہو جانے کے باوجود آپ پورے انہماک کے ساتھ ٹھوس علمی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور اس دوران میں بہت سی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ اور کر رہے ہیں۔ ایک دن میں نے کہا ”اب تو آپ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ یہ زمانہ تو آپ کے آرام کا ہے۔ اس قدر حیرت کیوں اٹھاتے ہیں؟“ فرمانے لگے ”طبیعت کو کام کرنے کی کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ بیکار بیٹھنے سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ اسی لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں“

ترجمہ کی حیرت انگیز قابلیت | صاف سلیس اور نہایت بامحاورہ ترجمہ کرنے کی عیسوی حیرت انگیز قابلیت قدرت نے آپ کو ودیعت کی ہے، اس میں ہندوستان بھر میں آپ کا کوئی اور مثیل نہیں صفحوں کے صفحے پڑھتے چلے جائیں، کہیں کوئی مشکل اور غیر مانوس لفظ نہیں ملے گا۔ اور پھر مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق کتابوں کا ترجمہ ایسی روانی کے ساتھ کرتے ہیں کہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوتی ہے ایک مرتبہ خود کہہ رہے تھے کہ ”انگریزی لٹریچر پڑھنے کا لطف ہی جاتا رہا۔ جب کوئی کتاب ہاتھ میں لیتا ہوں تو بجائے انگریزی الفاظ کے ان کا اردو ترجمہ ہی دماغ میں گشت کرنے لگتا ہے“ مولوی صاحب نے شادی نہیں کی | موجودہ زمانے کا یہ سب سے بڑا مترجم اور فاضل ادیب شادی بیاہ کے جھگڑوں سے بالکل آزاد رہا۔ اور ساری عمر نہایت وفاداری کے ساتھ عروس ادب کی ناز برداری میں گزار دی۔ خداوند کریم اردو کے اس محسن کو اردو کی خدمت کے لئے تادیر سلامت رکھے۔

# تراجم اور تصنیفات کی تفصیل

مولانا کی سوانح حیات تو ہم مختصر طور پر بیان کر چکے اب آپ کی تصنیفات۔ تالیفات۔ اور مضامین وغیرہ کی ایک نہرست اور ہر ایک کتاب کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین کو اُس عظیم الشان علمی خدمت کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے جو مولوی عنایت اللہ صاحب اس وقت تک اُردو ادب کی کرچکے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اُردو لٹریچر میں اپنے قلم کے ذریعہ نہایت بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اور اس قابل قدر اضافہ پر اُردو کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مولوی صاحب کی علمی خدمات کا سلسلہ ۱۸۸۸ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ آپ علی گڑھ کالج کی نورتحہ ایرکلاس میں پڑھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً بعض مضامین کا ترجمہ سرستیدار مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کے کہنے سے انگریزی سے کیا کرتے تھے۔ جو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپا کرتے تھے۔ لیکن آج اُن کا کوئی نام و نشان موجود نہیں۔ اسی زمانہ میں مولوی عنایت اللہ نے قانون ٹرسٹیان مدرسہ العلوم علی گڑھ کے انگریزی ترجمہ میں مسٹر بک کی امداد کی۔ جسے سرستیدار نے اُردو میں کچھ کر مسٹر بک کو انگریزی ترجمہ کے لئے دیا تھا۔ اسی طرح شمس الملہار مولانا شبلی کے مشہور اُردو رسالہ ”الجزیرہ“ کے انگریزی ترجمہ میں آرنلڈ صاحب کو مولوی صاحب نے امداد دی۔ اس طرح کہ سارے مقالہ کا انگریزی میں خود ترجمہ مکمل کر کے آرنلڈ صاحب کے پاس لے گئے۔ اور انھوں نے اس کی تصحیح اور ترمیم و تیسخ کر کے اُسے تیار کیا۔ یہ انگریزی ترجمہ چھپ گیا تھا مگر اب نایاب ہے۔

**۱۔ گاؤں کا قبرستان**۔ شاید یہ آپ کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ تھا مس گرے (۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۸ء) ایک مشہور شاعر ہے جس نے گاؤں کے قبرستان میں غریب کسانوں کی شکستہ قبروں کے نظارہ سے متاثر ہو کر اُن کا ایک پر درد مرثیہ لکھا۔ یہ نظم انگریزی لٹریچر میں ایک بہترین نظم مانی جاتی ہے۔ اور گرے کی ایچی کے نام سے

مشہور ہے ”یلچی“ گئے نے فروری ۱۹۵۷ء میں لکھی تھی۔ ۱۳۷ برس کے بعد اگست ۱۹۸۸ء میں مولوی صاحب نے اس کا نثر ترجمہ کیا۔ اور اس سال کی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جب مارچ ۱۹۳۹ء میں چند روز کے لئے مولوی صاحب پانی پت تشریف لائے اور اس کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ ”کیا یہ ترجمہ کہیں شائع ہو چکا ہے؟“ فرمانے لگے ”یاد نہیں پڑتا“ میں نے کہا ”پھر آپ ڈیرہ دون پہنچ کر یہ ترجمہ مجھے بھیج دیں“ مولوی صاحب نے وعدہ فرمایا اور میں نے یکم مئی ۱۹۳۹ء کو کتابی شکل میں اسے شائع کر دیا۔ ۹ صفحہ کی کتاب ہے اور نظم کے ۳۱ شعر ہیں جن کا نثر ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس۔ آسان اور پڑا تر ہے۔

(۲) **مضمون اشاعت اسلام دین و مجمع البحرین**۔ مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڑھ کالج اشاعت اسلام کی تاریخ کے متعلق ایک کتاب انگریزی میں لکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے متعلق مواد فراہم کر رہے تھے۔ چنانچہ چین میں اشاعت اسلام کے متعلق جو مسودہ مضمون انھوں نے تیار کیا تھا، مولوی صاحب نے قلمی مسودہ سے اُس کا اردو ترجمہ کیا۔ اور محمد انجیکیشنل کانفرنس کے اجلاس چہارم منعقدہ ۱۹۸۹ء میں بمقام الہ آباد پڑھ کر سنایا۔ بعد میں یہ مضمون کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا۔

(۳) **مضمون اشاعت اسلام در ہند**۔ مسٹر آرنلڈ کے قلمی مسودہ سے اُردو میں مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا جو مصنف کے صرف سے دہلی میں طبع ہوا۔

(۴) **مضمون اشاعت اسلام ترکوں کے ذریعہ سے**۔ یہ بھی متذکرہ بالا کتاب کا ایک حصہ ہے جس کا اُردو ترجمہ مولوی صاحب نے کر کے کانفرنس کے اجلاس پنجم منعقدہ ۱۹۸۹ء میں بمقام علی گڑھ سنایا۔ اور بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

(۵) **تذکرہ ابوریحان بیرونی**۔۔ علمی دُنیا کا کون شخص ہو گا جو بیرونی کے نام سے واقف نہ ہو۔ اس بے نظیر محقق اور زبردست فاضل کی اُردو میں یہ سب سے پہلی مختصر سوانح عمری ہے۔ جو بہت تحقیق و تلاش اور انتخاب و اقتباس کے بعد مولوی صاحب نے کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ۱۹۹۱ء میں لکھی۔ مگر کانفرنس میں پیش نہ ہو سکی۔ اس لئے ۱۹۹۲ء کی کانفرنس کی روئداد کے ساتھ سرسید نے اسے علیحدہ کتابی شکل میں ۱۹۹۳ء میں شائع

کر دیا تھا۔ اگرچہ ۲۸ صفحے کا مختصر رسالہ ہے مگر بڑی محنت سے مرتب ہوا تھا۔ بعد میں مولوی سید وحید الدین تسلیم نے بھی اسے چھوٹی تقطیع پر چھپوا دیا تھا۔

(۶) **ترجمہ تقریر مسٹر مارلین**۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج میں برادر ہڈا مجلس

(الاخوان) کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد پڑی۔ جس کے سکریٹری مسٹر مارلین قرار پائے۔ اس انجمن کے پہلے سالانہ جلسہ منعقد فروری ۱۸۹۳ء میں مسٹر مارلین نے جو تقریر انگریزی میں

کی تھی، سر سید کے ارشاد پر مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ مارچ ۱۸۹۳ء میں کیا تقریر ۱۶ صفحے کی تھی۔ یہ ترجمہ ابتداً علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں اور پھر علیحدہ کتابی شکل میں چھپا۔

علاوہ ازیں اسٹریچی ہال کے دروازے پر بھی کندہ کیا گیا۔ اور یہ کتبہ اب تک وہاں موجود ہے۔

(۷) **نیچرل سائنس کے عجائبات** } یہ تینوں مضامین سر سید کے رسالہ تہذیب الاخلاق

(۸) **حکایات دیوجانش حکیم** } کے نائل (۱۲۱ تا ۱۲۲ء مطابق ۱۸۹۴ء) میں علی الترتیب

(۹) **انسان کی زندگی کی حالت** } یکم ربیع الثانی یکم جمادی الثانی اور یکم رجب کے

پرچوں میں انگریزی سے ترجمہ ہو کر چھپے۔

(۱۰) **مکافات**۔ یہ مضمون مشہور ادیب ایمرسن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو تہذیب

الاخلاق میں ۱۳۱۲ء میں ابتداً چھپا تھا۔ اور بعد میں مئی ۱۹۳۵ء کے رسالہ "ساقی" میں

۱۶ صفحات پر شائع ہوا۔ یہی وہ مضمون ہے جس کے ترجمے پر سر سید نے مولانا ذکار اللہ کو

لکھا تھا کہ "اگر تم ایسا عمدہ ترجمہ کر دو تو جو کچھ کہو نذر کروں"

(۱۱) **ترجمہ مضمون جان فسک**۔ یہ مضمون مولوی عنایت اللہ نے سر سید کی

فرمائش سے ترجمہ کیا تھا۔ سید صاحب نے اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کر کے نیچے

"عنایت اللہ سید احمد" لکھ کر اسے "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیا۔

(۱۲) **خواب پریشیاں**۔ یہ بہت ہی پُر لطف اور مزاحیہ فسانہ ہے جو شاہجہاں بک

ایجنسی دہلی نے چھوٹی جیبی تقطیع کے ۴۸ صفحات پر چھپوایا ہے۔ دراصل یہ ایک خط ہے جو

۱۸۹۲ء میں مولوی صاحب نے اپنے دوست مرزا محمد انور گورگانی مرحوم کو بہاولپور

لکھ کر بھیجا تھا۔

(۱۳) ترجمہ امپیریل رول ان انڈیا :- مسٹر مارسن نے یہ کتاب پالیٹکس پر لکھی تھی۔

جس کے پانچ چھ ابواب کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ قیام دہلی کیا۔ مگر یہ نامکمل رہا۔ اور چھپا نہیں۔

(۱۴) دعوتِ اسلام :- یہی وہ معرکہ آرا اور ہتہم بالشان کتاب ہے جس کی وجہ سے

مولوی عنایت اللہ کا نام اتمامِ اُردو داں علی طبقہ میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گیا۔ مولوی صاحب کے اُستاد پروفیسر ٹی۔ ڈیلو آرنلڈ نے کامل دس سال کی تحقیق و تلاش اور ہندوستان اور یورپ کے تمام مشہور کتب خانوں کی چھان بین کر کے یونانی۔ لاطینی۔ جرمن۔ انگریزی۔ اطالوی۔ اسپینی۔ پرتگیزی۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کتابوں سے اخذ و انتخاب کر کے ایک نہایت ہی بے نظیر اور بے مثل کتاب انگریزی میں تالیف کی جس میں پُر زور شواہد اور زبردست دلائل کے ساتھ یورپین مصنفین کے اس ناپاک ہتھان کی تردید کی کہ ”اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا ہے“ انھوں نے نہایت جامعیت اور حسن ترتیب کے ساتھ ابتدا سے اپنے زمانے تک دُنیا کے اُن تمام ممالک میں جن کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی کوششوں کی تاریخ بیان کی۔

یعنی عرب۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ کاکیشیا۔ جرجان۔ طبرستان۔ ایران۔ خراسان۔ افغانستان۔ ہندوستان۔ کشمیر۔ تبت۔ ترکستان۔ سائبیریا۔ چین۔ تاتار۔ اسپین۔ ترکی۔ ابانیا۔ بلغاریا۔ سرویا۔ بوسینیا۔ مانچی نگر۔ روس۔ مصر۔ نوبیا۔ حبش۔ طرابلس۔ الجزائر۔ الجزائر۔ مراکو۔ وسط افریقہ۔ کیپ کوسٹ کولونی۔ مالدیپ۔ سماٹرا۔ جاوا۔ ملوکا۔ بورنیو۔ سلیبیز۔ فلپائن۔ زولو۔ نیوگنی۔ کریٹ۔ امریکہ کے بعض جزائر۔ ملایا۔ اور ملاکا وغیرہ۔

اس کتاب کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ فاضل مؤلف نے اس کی ترتیب میں جن بے شمار کتابوں سے مدد لی ہے اُن کے نام باریک ٹائپ کے ۱۲ صفحات میں آئے ہیں تیرہ سو برس میں ایسی بے نظیر محققانہ کتاب کوئی نہیں لکھی گئی جس نے ایک طرف محترضین کے منہ بند کر دیے اور دوسری طرف اسلام کا حسین اور خوبصورت چہرہ دُنیا کو دکھایا۔ حقیقت یہ کتاب لکھ کر جہاں آرنلڈ نے لافانی شہرت حاصل کر لی وہاں مسلمانوں پر زبردست احسان

بھی گیا! اور ان کے لئے وہ کام کیا جو خود ان کے کرنے کا تھا۔

جب ۱۸۹۶ء کے آخر میں یہ کتاب چھپ کر ولایت سے آئی تو سرسید نے بڑے شوق اور اصرار سے مولوی عنایت اللہ سے اس کے اُردو ترجمے کے لئے کہا۔ اور خود ہر طرح امداد کا وعدہ کیا۔ اور فرمایا کہ کتاب کا بیچ کی طرف سے چھپے گی۔ اور اس کا معاوضہ تمہیں ایک ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ چنانچہ جنوری ۱۸۹۶ء میں مولوی صاحب نے کام شروع کر دیا۔ پانچ بابوں کا ترجمہ تو مولوی صاحب نے خود سرسید کو سنا لیا۔ اور انہوں نے اس میں کہیں کہیں ترمیم اور اصلاح کی جس کی مفصل کیفیت قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے۔ ان پانچ بابوں کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ ”اب دہلی سے میرے پاس ایک ایک باب کا علیحدہ علیحدہ ترجمہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ جب ساری کتاب کا ترجمہ ختم کر لو تو اکٹھا بھیج دینا۔ اگر درمیان میں کوئی بات مجھ سے پوچھنے کی ہو تو خط کے ذریعہ دریافت کر لینا“

چنانچہ نومبر ۱۸۹۶ء میں سب ترجموں کے تمام کتاب کا ترجمہ ہو گیا۔ اور سرسید نے بعد اصلاح صوفی محمد قادر علی خاں صاحب مرحوم کے مطبع مفید عام میں چھپنے کے لئے اگرہ بھیج دیا۔ مگر جس کتاب کو سید مرحوم نے اس قدر شوق سے ترجمہ کرایا تھا اور جس پر اتنی محنت کی تھی، افسوس کہ اس کو مکمل چھپی ہوئی دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔ کتاب ابھی مطبع میں ہی تھی کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے انتقال سے چھ سات ماہ بعد کتاب مطبع سے چھپ کر آئی۔ پوری کتاب دو دیا جوں۔ تیرہ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے جس میں جا بجا متعدد نقشے اور چارٹ بھی لگے ہوئے ہیں۔ صفحات ۴۹۸ ہیں۔ جب کتاب چھپ چکی تو مولوی سید زین العابدین مرحوم نے فرمایا کہ ہمارے پاس اس وقت زیادہ گنجائش نہیں۔ آپ مقررہ معاوضہ میں کچھ کمی کر دیں۔ مولوی صاحب نے کہا ”جو آپ کی مرضی۔ انہوں نے سات سو روپے دیئے۔ اور کہا کہ ”باقی کے تین سو اس وقت دیں گے جب یہ کتاب دوسری دفعہ چھپے گی“۔ مگر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی۔ حالانکہ پہلا ایڈیشن عرصہ دراز سے ناپید ہے۔ سنا ہے کہ مدراس یونیورسٹی میں اس کتاب کے کچھ اجزاء درس میں رکھے گئے تھے۔

(۱۵) انگریزی نظائر قانون کا ترجمہ :- مولوی احمد علی خاں صاحب سبج

نے چند نظائر قانونی ۱۸۹۹ء میں مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے پاس اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے بھیجے۔ مولوی صاحب نے جو ترجمہ کر کے بھیجا وہ انھیں پسند آیا۔ اور اس کا کچھ معاوضہ بھی انھوں نے دیا۔

(۱۶) زلفی (حصہ اول) یہ کتاب ریڈیا ریڈیکنگ کی کتاب ”جنگل بک“ کی پہلی کہانی

سے ماخوذ ہے۔ جو آپ نے قیام دہلی کے زمانے میں تیار کی۔ اور پہلی مرتبہ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء کو جادو پریس جو نپور سے ۶۸ صفحات پر ”جنگل کی پہلی کہانی“ کے نام سے شائع ہوئی۔ بعد میں اُسے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ”زلفی“ کے نام سے چھاپنا شروع کیا۔ اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن وہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بچوں کے لئے ایک بہت ہی مزیدار اور دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک انسان کے بچے کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس نے بھیڑے کے بھٹ میں پرورش پائی۔ اور بھیڑیوں کے جنگل میں پل کر بڑا ہوا۔

بجائیت زبان کی حلاوت اور شیرینی کے مولوی عنایت اللہ کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ طرز ادا نہایت ہی دل نشین۔ بندشیں بے حد سست۔ عبارت بہت ہی سلیس۔ الفاظ اور فقرے دہلی کی با محاورہ اور ٹھیک زبان کا بہترین نمونہ۔ مختصر یہ ہے کہ جس قدر عمدہ۔ دلچسپ اور دلآویز زبان مولوی صاحب نے اس کتاب میں پیش کی ہے، شاید ہی اردو لٹریچر میں اس کی مثال مل سکے۔ کتاب اگر بچوں کے لئے لکھی گئی ہے مگر بڑے بڑے ادیب بھی اسے پڑھتے ہیں تو عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ادب لطیف کے شائقین اگر دس مرتبہ بھی اسے پڑھیں گے تو یقین ہے کہ ان کا دل نہیں بھرے گا۔ اور پھر پڑھنے کو جی چاہے گا۔ موجودہ زمانہ کے ایک بڑے مشہور نثر نگار اور ادیب کا قول ہے کہ ”دماغی کام کرتے کرتے جب طبیعت گھبرانے لگتی ہے تو میں ”زلفی“ کے کئی کئی جلد پڑھتا ہوں“ حقیقت یہ کتاب ترجمہ نہیں ہے بلکہ جنگل بک کو پڑھ کر جو نقوش ذہن میں رہ گئے تھے انھیں مولوی صاحب نے اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔ اور بلا مبالغہ نثر میں شاعری کی ہے۔

(۱۷) زلفی (حصہ دوم) یہ کتاب ۱۲ جون ۱۹۰۲ء کو پہلی مرتبہ چھپی۔ اس کے بعد دارالاشاعت

پنجاب سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ شمس العلماء مولوی محمد اسماعیل صاحب مرحوم (مطرح) کو یہ قصہ اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اپنے صرت سے اُسے چھپوایا تھا۔ شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم اور لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بھی ان دونوں کہانیوں کی اپنے پرائیویٹ خطوط میں نہایت تعریف کی تھی۔ افسوس وہ خطوط مولوی صاحب کے پاس سے کہیں گم ہو گئے۔

(۱۸) **اندھی پھول والی کا گیت** :- لاڈلٹن کے مشہور ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" میں سے لے کر جون پور کی ملازمت کے زمانے میں ترجمہ کیا۔ اور راسالہ مجزن لاہور میں چھپوایا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ بعد میں بہت سے شعرا نے اسے منظوم کیا۔

(۱۹) **ارض نہرین** :- بابل و اشور کے قدیم ترین شہروں کا زمین سے کھود کر نکالا جانا۔ اور وہاں کے قدیم تمدن کا حال ایک امریکن فاضل نے نہایت تحقیق اور تلاش سے لکھا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ جو بلا د بابل و اشور کے پرلے شہروں کا زمین سے کھود کر برآمد کیا جانا۔ اور وہاں کا قدیم تمدن کے عنوان سے پہلے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں باقسطا چھپا۔ اور اس کے بعد جولائی و اگست ۱۹۱۹ء کے رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اور پھر کتابی شکل میں طبع ہوا۔

(۲۰) **عرب قدیم کا تمدن** :- انگلستان کے مشہور عالم سیموئیل لینگ کی کتاب "ہیبومن اور یجتر" کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ جو علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں باقسطا چھپا۔ اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب قدیم کا تمدن بابل۔ اشور اور مصر کے تمدنوں سے قدامت میں کچھ کم نہیں ہے۔

(۲۱) **پیرک لیز اور ایجنز کا دور اقبال مندی** :- پیرک لیز، یونان کا وہ نامور شخص تھا جس نے آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے ایجنز کی شہری ریاستوں کو بلا جلا کر شہنشاہی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں جو ایولین رابٹ ایم، اے کی لکھی ہوئی ہے اس مدبر کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اسی ذیل میں مصنف نے یونانیوں کے مذہب، ان کے دیوتاؤں کے قصے۔ ان کی ربت تراشی اور نقاشی کی کیفیت۔ ان کی شاعری و تاریخ نویسی اور ان کے آئین و

قوانین کی تفصیل بڑی خوبی اور جامعیت کے ساتھ تحریر کی ہیں۔ یونان قدیم کے گوناگوں حالات معلوم کرنے کے لئے یہ ایک بہت ہی پُر از معلومات کتاب ہے جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے اس کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ ملازمت گویا کیا۔

یورپ پر ترجمہ ۳۴۵ صفحات پر ۱۹۲۲ء میں چھپا۔

(۲۲) **قسطنطین** - قسطنطین مشہور شہر قسطنطنیہ کا بانی اور روما کا پہلا تاجدار ہے جس نے

عیسائی مذہب قبول کیا۔ جان۔ بی فرھ نے لندن سے اکتوبر ۱۹۰۷ء میں اس کی مفصل تاریخ عمری لکھی۔ مولوی صاحب نے گویا میں عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے اسے اردو کا لباس پہنایا اور ۱۹۲۳ء میں ۳۷۰ صفحات پر یہ ترجمہ چھپا۔

(۲۳) **یونانی شہنشاہیت**: ولیم اسکاٹ فرگسن پروفیسر تاریخ قدیم ہرورڈ یونیورسٹی

کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو انھوں نے جون ۱۹۱۳ء میں شائع کی۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو پروفیسر مذکور نے لوول انسٹیٹیوٹ واقع بوٹن میں پڑھے تھے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں ان باتوں کا بیان ہے جن سے یونان میں شہنشاہی حکومت کا نشوونما ہوا۔ باقی ابواب میں ان خاص خاص شہنشاہیوں کی امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے جو یونان میں قائم ہوئیں۔ ایتھنز اور اسپارٹا کی شہنشاہیاں۔ سکندر عظیم کی فتوحات۔ سلاطین اطلیسی و سلیوقیہ کے حالات اور شاہان انتی گونی کے عروج و زوال کے مرقعے اس میں کھینچے گئے ہیں۔ یہ کتاب یونان کے عہد عروج کی دلچسپ تاریخ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے اس کا ترجمہ مولوی صاحب نے بزمانہ قیام گویا کیا۔ جو ۲۵۸ صفحات پر ۱۹۲۲ء میں چھپا۔

(۲۴) **جاپان کا تعلیمی نظم و نسق** - سر اس مسعود مرحوم (ڈائریکٹر تعلیمات حیدرآباد

دکن) جاپان کی تعلیمی حالت دیکھنے کے لئے رخصت لے کر وہاں گئے۔ اور ساڑھے تین مہینے جاپان میں رہ کر تعلیم کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کیں۔ اور واپس حیدرآباد پہنچ کر انگریزی میں اپنی سیاحت اور تحقیق کے نتائج کتابی شکل میں اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع کئے۔ اس کا اردو ترجمہ مصنف مرحوم کے ارشاد پر مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے لئے کیا۔ جس کا مواضع نو سو روپے وصول ہوا۔ کتاب ۲۴ بابوں اور متعدد نقشوں پر مشتمل ہے۔ جس میں جاپان کے

تعلیمی حالات کے ساتھ وہاں کے سیاسی اور معاشرتی کوائف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے صفحات ۴۸۶ ہیں۔ اور بہت خوبصورت طریقہ سے شائع ہوئی ہے۔

(۲۵) **مائیس** :- اناطول فرانس یورپ کا مشہور و معروف مصنف اور فنانہ گار ہے۔ جسے

۱۹۲۱ء میں اپنی ادبی خدمات کے صلہ میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ "مائیس" اس کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اور اپنے دلکش اسلوب بیان۔ اپنی لطافت اور سلاست۔ اپنے موضوع کی خوبی اور دلچسپی۔ اور قصہ کی دلکشی کے باعث یورپین لٹریچر میں اپنا جواب نہیں دیتا۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں نہایت ہی شوق اور محنت کے ساتھ مولوی صاحب نے اس کا

ترجمہ کیا۔ مولوی صاحب کو یہ ترجمہ بے حد عزیز ہے۔ اور وہ اس کو اپنے بہترین ترجموں میں سے سمجھتے ہیں۔ کتاب میں جس قدر تمبیحات استعمال کی گئی ہیں ان کی تفصیلات اصل قصہ میں نہیں ہیں۔ انھیں مختلف کتابوں سے تلاش کر کے بے حد محنت کے ساتھ مولوی صاحب نے

آخر میں لکھا ہے۔ ان تمبیحات کی تفصیلات کی تلاش میں اصل کتاب کے ترجمے سے زیادہ محنت آئی۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۲۶ء میں دوسری قسط کے ۴۸۰ صفحات پر شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن بڑی قسط کے ۴۲۸ صفحات پر

ساتھی بک ڈپو دہلی نے ۱۹۳۶ء میں چھپا یا۔

(۲۶) **اندلس کا تاریخی جغرافیہ** :- ہندوستان میں شاید ہی کسی مولف نے اپنی کتاب

کی تالیف اور ترتیب پر اس قدر طول طویل اور صبر آزمائش کی ہو جیسی اندلس کے تاریخی جغرافیہ پر مولوی عنایت اللہ نے کی۔ یہ محنت قریباً ۱۸۹۶ء سے شروع ہوئی۔ اور ۱۷ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ختم ہوئی۔

شہروں کے ناموں کی تحقیق کا شوق و تحقیقت مولوی صاحب کو زمانہ طالب علمی سے تھا۔ مگر اصلی شوق ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا۔ انھی ایام میں رام پور کے ایک صاحب نے سفر نامہ ابن جبیر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مولوی صاحب نے ان سے سپین کے ایک شہر

( WALLADOLID ) کا عربی نام دریافت کیا۔ ان کا جواب آیا کہ اس شہر کا عربی نام " بلاوولید" تھا۔ مگر جب مولوی صاحب نے اس نام کی مزید تحقیق کی تو یہ بات باطل ثابت

ہوئی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ اُن کا محض قیاس ہی قیاس تھا۔ مولوی صاحب نے اور سینکڑوں ناموں کے ساتھ اسپین کے جغرافیہ میں اس نام کو پسینی شکل میں لکھ کر اس کا پتہ لکھا ہے جب ۱۸۹۷ء میں مسٹر آرنلڈ کی کتاب پریسنگ آف اسلام کا مولوی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا تو اس میں اسپین کے شہروں کے عربی نام مولوی صاحب مسٹر آرنلڈ سے دریافت کیا کرتے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا تو عربی نام لکھ دیتے۔ معلوم نہ ہوتا تو اسپینی نام اردو حروف میں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب نے دہلی میں مولوی عبدالاحد کے مطبع سے ”عجم البلدان“ خریدی۔ اور مستعدی کے ساتھ اس کام کو کرنا شروع کیا۔ بریلی میں اسپین کا ایک بڑا نقشہ منگوا یا۔ اور اس میں شہروں کے عربی نام جس قدر معلوم ہوتے رہے اُن پر نشان کرتے رہے۔ گویا ر کے زمانہ بقیام میں ”پاسکل دی گینگوس“ کا انگریزی ترجمہ مقری مولوی صاحب نے خریدا۔ اور اس کے نوٹوں سے اسپین کے شہروں کے متعلق بہت کچھ اخذ کیا۔ حیدرآباد آنے پر آپ کو ادراسی کا جغرافیہ مع فرانسسی ترجمہ کے ملا۔ اور اس میں سے بہت کچھ آپ کو حاصل ہوا۔ دراصل سب سے زیادہ مصروفیت کا زمانہ اس جغرافیہ پر حیدرآباد میں گذرا۔ سینکڑوں مختلف پرچوں پر جو ہزار ہا یادداشتیں وقتاً فوقتاً آپ لکھتے رہتے تھے اب اُن سب یادداشتوں کو نکالا۔ اور انھیں باقاعدہ ترتیب دیا۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک بڑی محنت کے ساتھ مسلسل اس کام میں مشغول رہے۔ اور جب تک جغرافیہ چھپ نہ لیا آرام سے نہ بیٹھے۔ غرض ۲۸ سال کی محنت جب ۱۹۲۷ء میں کتابی شکل میں شائقین تاریخ اور صاحبانِ ذوق کے سامنے آئی تو ہر شخص ہکا بھکا کہہ

اس طرح کا حُسن ہوا ایسا جمال ہو

حقیقت یہ ہے کہ اس جغرافیہ کے مرتب کرنے میں مولوی صاحب نے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جس زبان سے اور جس کتاب سے جو کچھ ملا۔ لے کر جمع کرتے رہے۔ عربی اور انگریزی تاریخوں جغرافیوں نقوشوں اور اٹلسوں میں سے جو اسپین کے متعلق تھیں کوئی کتاب باقی نہ چھوڑی جس کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کر کے اُس میں سے ضروری اقتباس نہ کیا ہو۔ اس حقیقت واقعہ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ دنیا کی کسی زبان میں بھی اندلس مرحوم کے جغرافیہ

کے متعلق ایسی مکتل اور بے مثل کتاب موجود نہیں۔ اُردو زبان ایسی لاجواب اور بے نظیر کتاب پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ اور مولوی عنایت اللہ کا یہ احسان اُردو لٹریچر پر ہمیشہ باقی رہے گا کہ انھوں نے اس کے لئے اسپین کے ادبی سمندر میں سے ساہاساں کی شناوری کے بعد ایسا گوہر آبدار برآمد کیا کہ ہر خواص ادب اُس کی آب و تاب دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ مولوی صاحب نے یہ کتاب ایسی ہتم بالشان اور عجیب و غریب لکھی ہے کہ وہ اگر اس کے سوا ایک حرف بھی نہ لکھتے تو اکیلی یہ کتاب ادبی دُنیا میں اُن کے نام کو عزت سے زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ اس کتاب کا مواضع آپ کو سات ہزار سکہ عثمانیہ ملا۔ اور کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی جیسی بے مثل محققانہ تالیف ہے ویسی ہی نفاست اور خوبی کے ساتھ چھپی بھی ہے۔ بہت بڑی تقطیع۔ نہایت واضح اور خوشخط کتابت۔ دیدہ زیب طباعت نفیس جلد اور خوشما نقشوں سے مزین۔ اعلیٰ درجہ کا کاغذ۔ ۵۶۰ صفحات۔ اُردو زبان کی بہت کم کتابیں اس شان سے شائع ہوتی ہیں۔ کتاب کے ابتدائی ابواب میں اندلس کا عام جغرافیہ قدیم باشندوں اور قبائل عرب و بربر کا حال مسلمانوں کے زمانہ میں وہاں کی زراعت صنعت و تجارت کی کیفیت وغیرہ کا نہایت جامع بیان ہے۔ اور اس کے بعد انتہائی تلاش و تحقیق کے ساتھ اندلس اور پرتگال کے قریب ساڑھے آٹھ سو مقامات کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات لکھے ہیں۔ ہر ایک شہر کا پہلے تو قدیمی نام بتایا ہے۔ پھر اس شہر کی عمارات مصنوعات۔ پیداوار اور تجارت وغیرہ کا حال بیان کیا ہے۔ زراعت اور شہر کی تاریخ ابتدا سے بیان کی ہے۔ جو جو قبائل عرب وہاں وقتاً فوقتاً آباد ہوتے رہے اُن کا حال لکھا ہے اُس شہر میں جو نامور شخص گذرے ہیں اُن میں سے بعض کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ غرض تحقیق و تلاش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور اندلس کی تاریخ کے شائقین کے ہاتھوں میں ایسی قابل قدر کتاب فیدی ہے جس کا ایک ایک لفظ برسوں کی تلاش و محنت کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب کا عظیم الشان علمی کارنامہ فی الحقیقت اُردو لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

(۲۷) **تیمور** :- ایشیا کے اس عظیم الشان فاتح اور زبردست شہنشاہ کی اب تک اُردو میں کوئی مفصل سوانح عمری نہ تھی۔ ہیرلڈ لیمب ایک انگریز مصنف نے تیمور پر ایک بہت دلچسپ

اور پُر از معلومات کتاب لکھی تھی۔ نواب حیدر نواز جنگ بہادر سرگبر حیدری کی فہمائش کی تعمیل میں مولوی صاحب نے اس کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جو یکم دسمبر ۱۹۳۰ء کو ختم ہوا۔ مولوی صاحب نے خود ہی اس کتاب کو مطبع معارف اعظم گڑھ میں بڑی نفاست کے ساتھ چھپوایا۔ آٹھ نوہت قدیم تصاویر اور دو نقتے کتاب کی زینت ہیں ۴۹۳ صفحات ہیں کاغذ نہایت نفیس چمکانا لگایا گیا ہے۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب لکھ کر مولوی صاحب نے اردو ادب میں بہت قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

(۲۸) **چنگیز خاں** - صحرائے گوبی کا وہ خانہ بدوش انسان جس نے دنیا کی تین عظیم نشان شہنشاہیوں کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ہیبت ناک بہادر جس نے دنیا کی پچاس قوموں پر حکومت کی وہ زبردست شہنشاہ جس نے کوریا سے لے کر آرمینیا تک اور بت سے لے کر والکنائیٹیل تک اپنی سلطنت قائم کر لی۔ سارا ایشیا اور یورپ جس کے نام سے کانپتا تھا۔ وہ تاریخ میں چنگیز خاں کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ قتل و غارت اور تباہی و ہلاکت کے اس دیوتائے عظم کی مفصل سوانح عمری ہے جو ہیر لڈلیمب نے نہایت دلچسپ انداز بیان کے ساتھ لکھی ہے۔ مولوی صاحب نے تیمور کو ختم کرنے کے بعد مولف سے اجازت لے کر اس کا ترجمہ کیا۔ اور پھر اسے "تیمور" کی مانند نہایت نفاست کے ساتھ اعلیٰ چمکے کاغذ پر مارچ ۱۹۳۲ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپوایا۔ کتاب کے صفحات ۳۴۲ ہیں شروع میں چنگیز خاں کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے۔ جو کسی قدیم مرقع سے لی گئی ہے۔

تیمور اور چنگیز خاں دونوں نہایت دلچسپ اور پُر لطف کتابیں ہیں۔ پڑھ کر ذہن کا مزہ آتا ہے۔ اور مستند تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

(۲۹) **حکم السحر** - رائڈر میگرڈ نہایت ہیبت ناک سنسنی خیز عجیب و غریب اور حلاف قیاس و عقل نشانے لکھنے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ یہ اسی کی کتاب "مارٹنگ سٹار" کا نہایت ہی پُر لطف اور سلیس ترجمہ ہے جو مولوی صاحب نے بزمانہ قیام حیدرآباد کیا۔ قصہ نہایت دلچسپ اور مزیدار ہے۔ اور بہت عمدگی کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ یہ آج سے پانچ ہزار برس پیشتر کی مصری زندگی کا ایک بہت ہی پُر لطف مرقع ہے۔ شاہد احمد صاحب ایڈیٹر "ساتی"

حیدرآباد گئے تو مولوی صاحب سے اصرار کر کے یہ ترجمہ ساتھ لیتے آئے۔ اور ۱۹۳۵ء میں شائع کر دیا  
صفحات ۳۷۶۔

(۳۰) **شہاب الدین ابن ماجہ** ۱۔ یہ وہ نامور ستیاچ اور جہازراں تھا جس کی  
رہنمائی کی بدولت واسکو ڈی گاما ساحل ہندوستان تک پہنچ سکا۔ یہ اس عرب ستیاچ کی  
سوانح عمری ہے۔ جو انگریزی سے ترجمہ کر کے مولوی صاحب نے جون ۱۹۳۵ء کے رسالہ "ساتی"  
دہلی میں شائع کرائی۔ صفحات ۱۰۴۔ اسے پڑھ کر تاریخ کے متعلق بڑے حیرت انگیز رازوں کا  
انکشاف ہوتا ہے۔

(۳۱) **بابل قدیم کے تمدن کا زمانہ** ۱۔ مولوی صاحب کا یہ تاریخی اور تحقیقی مضمون  
ستمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ ساتی میں ۱۲ صفحات پر چھپا۔

(۳۲) **چنگیز خاں کے سوانح حیات** ۱۔ یہ کتاب ایک روسی مصنف کی تصنیف کے  
انگریزی ترجمہ سے ماخوذ ہے جس نے بہت سی قدیم عربی اور فارسی تاریخوں سے اخذ کر کے  
یہ کتاب مرتب کی تھی۔ شائع کردہ شاہد احمد صاحب بی۔ اے۔ ایڈیٹر ساتی۔ صفحات ۶۲۔  
(۳۳) **اجونٹ لم ڈھیک اور موضع مگر گھاٹ کے مگر** ۱۔ یہ دلاویڑ اور  
دلچسپ کہانی اپریل ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساتی میں ۲۱ صفحات پر شائع ہوئی۔

(۳۴) **پورن چندر می کہانی** ۱۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز نثر ہے۔ ساتی  
دہلی کے جون ۱۹۳۶ء کے پرچہ میں ۱۲ صفحات پر چھپا۔

(۳۵-۳۶) **سلا مبو (حصہ اول و حصہ دوم)** شہرہ آفاق فرانسیسی انشاپرداز گستیو  
فلائیئر کے ناول کا ترجمہ ہے جو جون ۱۹۳۶ء میں ساتی بک ڈپو دہلی نے شائع کیا۔ اس کے  
بعض ابواب کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے رسالہ ساتی میں چھپ کر شہرت عام  
حاصل کر چکے تھے۔ اس میں آج سے دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ کی تہذیب اور اس کی رزم و جہم  
کے نقشہ پیش کئے گئے ہیں۔

(۳۷) **ہرودیا س** ۱۔ یہ گستیو فلائیئر کے ایک اور نہایت دردناک ناول کا ترجمہ ہے۔ جو جولائی  
۱۹۳۶ء کے رسالہ ساتی میں ۳۴ صفحات پر چھپا۔ اور بعد میں ساتی بک ڈپو دہلی نے اسے کتابی

شکل میں بھی شائع کیا۔

(۳۸) **کلیو پترا** ۱۔ یہ مصر کی اس نہایت مشہور و معروف ملکہ کی سوانح عمری ہے جو رسالہ ساتی کے اگست ۱۹۳۶ء کے نمبر میں ۱۴ صفحات پر چھپی۔

(۳۹) **داستانِ جہنم** ۱۔ اٹلی کے شاعر اور مفکر عظیم ڈائٹے (۱۶۶۵ء تا ۱۷۳۱ء) نے ”ڈیوانن کا میڈی“ کے نام سے ایک نہایت ہی بلند پایہ اور بے مثل نظم لکھی ہے جس میں خواب کی طرز پر جہنم۔ اعزاز اور بہشت کا حال بیان کیا ہے۔ اس کی یہ تصنیف یورپ میں نہایت مقبول ہوئی۔ اور اسے دنیا بھر کے اعلیٰ لٹریچر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بیسیوں تراجم اور سینکڑوں شرحیں اس کی اس وقت تک یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکی ہیں۔ پروفیسر ہاول اس کے متعلق کہتا ہے۔

”یہ کتاب محض دوسری دنیا کی خیالی داستان نہیں ہے۔ بلکہ ڈائٹے اس میں ٹری کاوش سے اپنے زمانے اور اس سے قبل کے زمانے کے علوم و فنون۔ تاریخ و روایات۔ معتقدات و توہمات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اور زمانہ وسطیٰ کے سبھی اعتقادات کی روشنی میں مادی دنیا کا نقشہ سماوی تمثیل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔“

مولوی عنایت اللہ نے اس کتاب کے حصہ جہنم (انفرنو) کا ترجمہ اپنے دوست مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے کی فرمائش سے کیا۔ ”انفرنو“ کے متعلق پروفیسر وٹے لکھتا ہے:-

”ڈائٹے کا جہنم ہماری گناہوں سے بھری ہوئی زندگی کی تصویر ہے۔ جو تمثیلی رنگوں سے رنگی ہوئی ہے جہنم کے عذاب جو اس میں دکھائے گئے ہیں دراصل دنیوی گناہ میں جن میں ہم مبتلا نظر آتے ہیں:-“

کتاب اپنی نوعیت میں جس قدر بے مثل ہے۔ اس نظم کی خوش قسمتی ہے کہ اُردو مترجم بھی اس کو ایسا ہی بے نظیر ملا۔ مولوی عنایت اللہ نے یہ ترجمہ اتنا شستہ۔ اتنا فصیح و بلیغ۔ اس قدر پاکیزہ اور دل فریب کیا ہے کہ واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اور اسے پڑھتے ہوئے بعض دفعہ تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم واقعی دوزخ میں کھڑے ہیں۔ ساتی بکڈ پونے یہ کتاب اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ۱۱۸ صفحات پر شائع کی جس کے شروع میں سید انصاری ناصری۔ بی۔ اے لیل ایل۔ بی۔ کا دیباچہ لکھا ہوا ہے۔ جس میں ڈائٹے کی سوانح حیات سے بحث کی گئی ہے۔

(۴۰) **سمبلین** ۱۔ شکسپیر کے مشہور و معروف ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔ جو رسالہ ساتی میں جولائی ۱۹۳۶ء سے اکتوبر ۱۹۳۶ء تک شائع ہوا۔

(۴۱) **انٹونی اور کلا بطرہ** :- شیکسپیر کے مایہ ناز مشہور و معروف ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ جو نومبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساتی میں ۲۵ صفحات پر چھپا۔ اور اب ترمیم و ترمیم کے بعد کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔

(۴۲) **میکلٹ** :- شیکسپیر کا شہرہ آفاق ڈرامہ ہے۔ جس کا مکمل ترجمہ جنوری ۱۹۳۷ء کے رسالہ ساتی میں ۸۳ صفحات پر چھپا۔ اور بعد میں کتابی شکل میں ساتی بک ڈپو کی طرف سے ۱۹۸ صفحات پر شائع ہوا۔

(۴۳) **راسیڈاس** :- ڈاکٹر جانس کے اس نہایت مشہور ناول کا ترجمہ ساتی میں فروری ۱۹۳۷ء سے جون ۱۹۳۷ء تک بافتنا ط چھپتا رہا۔ پورا ناول ساتی کے ۸۵ صفحات میں آیا۔

(۴۴) میکلتھ	۵۴	صفحات	یہ شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجمے ہیں۔ جو
(۴۵) ٹامس ایتھنز	۵۵	"	علی الترتیب رسالہ ساتی کے جنوری ۱۹۳۶ء
(۴۶) بادشاہ لی ار	۵۴	"	جولائی ۱۹۳۸ء۔ جنوری ۱۹۳۹ء اور جولائی
(۴۷) اوتھیلو	۶۲	"	۱۹۳۹ء کے پرچوں میں چھپے۔

(۴۸) **جولیس سیزر** :- صفحات ۷۹۔ شیکسپیر کے اس ڈرامہ کا ترجمہ مولوی صاحب نے مجھے بھیجا تھا۔ جو میں نے رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کو اشاعت کے لئے دے دیا ہے انشاء اللہ جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہو جائے گا۔ کتابت ہو چکی ہے۔

(۴۹) **رومیو جولیٹ** :- یہ بھی شیکسپیر کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔ جو مولوی صاحب نے حال میں ختم کیا ہے۔ اور عنقریب ساتی میں شائع ہو گا۔ یہ ترجمہ آپ نے نومبر ۱۹۳۸ء میں کیا تھا۔

(۵۰) **عبث نامہ اندلس** :- پروفیسر ڈوزی کی فرانسیسی کتاب کے انگریزی ترجمہ "سینس اسلام" کا جو مسٹر اسٹوک نے ۱۹۱۳ء میں شائع کیا، اردو ترجمہ ہے جو چار حصوں اور دو مجلدات میں آپ کے سامنے ہے انگریزی کتاب مولوی صاحب کے پاس یکم دسمبر ۱۹۱۳ء کو پہنچی اور آپ نے اسی وقت سے اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ابتداء میں صرف ریخا ل تھا کہ اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا جائے۔ مگر پھر پوری کتاب کے ترجمہ کا ارادہ کیا۔ جو ۲۹ جون ۱۹۲۹ء کو ختم ہوا۔ جید رابا کی ایک مجلس نے دو ہزار روپے اس کے معاون میں دینے چاہے۔ مگر مولوی صاحب نے تعلیمی کونسل میں اپنا ترجمہ پیش ہونے سے روک دیا۔ اور حق ترجمہ کے ۳۰

پونڈتقادا کرنے کے بعد خود ہی اس کے چھپوانے کا خیال کیا۔ سنی ۱۹۳۲ء میں جب میں حضرت مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب کے ہمارے حیدرآباد گیا تو مولوی صاحب مدوح نے میرے سپرد اس کے چھپوانے کا کام کیا۔ میری نالائق اور سستی۔ اور مولوی صاحب کی رُوباری اور تحمل کا یہ ترجمہ شاہکار ہے جس کے نتیجے میں آج دس برس میں ترجمہ چھپ کر مکمل ہوا۔

اس ترجمہ کی مکمل کیفیت میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں۔ لہذا یہاں ضرورت نہیں۔

(۵۱) **صلاح الدین اعظم** - صلیبی جنگوں کا مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی وہ بہاؤ

اور شجاع انسان ہے جس نے تنہا یورپ بھر کی متفقہ طاقتوں کا فوق العادہ دلیری کے ساتھ نہایت کامیاب مقابلہ کیا۔ اور سب کے دانت کھٹے کر دیئے۔ الواعزی شجاعت۔ رحم اور مروّت اخلاق کے ایسے عمیر العقول کا نام سلطان کی زندگی میں نظر آتے ہیں کہ پڑھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے۔ اب تک سلطان کی عربی۔ انگریزی اور اردو میں بیسیوں سوانح عمریاں لکھی گئیں، لیکن جس جامعیت، خوبی اور تفصیل کے ساتھ انگریز مورخ لین پوں نے ”سلاڈین“ لکھی ہے اسے کوئی سوانح عمری نہیں پہنچتی۔ مولوی عنایت اللہ صدر ہزار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس نہایت ہی دلچسپ کتاب کا دس پونڈتق ترجمہ ادا کر کے نہایت بے نظیر اور سلیس ترجمہ کیا۔ اس کی کتابت میں مکمل کرا چکا ہوں۔ اور انشاء اللہ عنقریب شائع کروں گا۔ قریباً ساڑھے تین سو صفحے کی کتاب ہوگی جس میں بہت سے قدیم فوٹو بھی ہوں گے۔

(۵۲) **تاریخ ادبیات عرب** - انگلنڈ کی کتاب ”لٹریچر ہسٹری آف عربس“ کے ایک باب

متعلق ”بین“ کا اردو ترجمہ مولوی صاحب نے بذات ہونی کیا تھا۔ مگر یہ ابھی تک چھپا نہیں۔

(۵۳) **تاریخ حکومت ہائے اسلامیہ اسپین** - پاسکل وی گیا گوس نے کتاب

”فتح الطیب“ مولف علامہ احمد المقرئ کے تاریخی حصوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا مولوی صاحب نے اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مگر یہ بھی ابھی تک نہیں چھپا۔

(۵۴) **تاریخ مغل** - سر ہنری ہوور تھ نے ”ہسٹری آف مغلوز“ کے نام سے چار ضخیم

جلدوں میں مغلوں کی تاریخ لکھی ہے جو ۱۷۷۷ء سے ۱۸۵۸ء تک شائع ہوئی۔ اس سے بہتر مبسوط اور مکمل اور مفصل تاریخ مغلوں کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی مغلوں کی ایسی ایسی سلطنتوں

اور ان کے ایسے ایسے قبائل کا حال نہایت تحقیق و تلاش کر کے سپرد قلم کیا ہے کہ عام تاریخوں میں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ چین۔ ترکستان۔ بخارا۔ خیوا۔ ولگا کے کنارے۔ قرم (کریما) ایران۔ روس۔ قازان اور دریائے ڈانیوب کے کنارے۔ غرض جہاں جہاں مغلوں نے مختلف اوقات میں حکومت کی سب کا مفصل اور مکمل بیان بڑی جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ مغلوں کی تاریخ کے متعلق یہ ایک نہایت ہی عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مولوی صاحب نے نہایت حیرت انگیز محنت اور بہت سے کام لے کر اس پیرانہ سالی ضعف و نقاہت اور بیماری کے دوران میں اس کے ترجمے پر کمر ہمت باندھی۔ اور مسلسل کام کرنے کے بعد فروری ۱۹۳۹ء میں ڈیڑھ دن میں اسے بجز آخری چند صفحات کے خاتمہ کو پہنچا دیا۔ مکمل ترجمہ مولوی صاحب نے مجھے بھیج دیا ہے قلمی مسودے کے چار ہزار صفحات ہیں۔ اصل انگریزی کتاب باریک ٹائپ کے ساڑھے تین ہزار صفحات پر ہے۔ جب اس ترجمے کی بے انتہا طوالت اور ضخامت کو دیکھتے ہیں اور مولوی صاحب کی موجودہ حالت پر نظر کرتے ہیں تو اس عمر میں اتنے عظیم الشان کام کی تکمیل پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ اور مولوی صاحب کی جوان سہمی پر بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔ خدا نے چاہا تو صلاح الدین کی طباعت اور تیاری سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوں گا۔

(۵۵) **حیات سقراط**، مولوی صاحب کی عمر چھ سات برس کی تھی جب کہ انھوں نے اُردو کی تیسری کتابیں سقراط کا حال لکھا تھا، اس کا اُردو پراسا پڑا کہ بی، لے پاس کرنے کے بعد متحدہ وکتا بوس انتخاب کے سقراط کے حالات جمع کرنے شروع کئے۔ مگر یہ مسودہ کہیں گم ہو گیا۔ پینتالیس چھیالیس برس کے بعد پھر سقراط کی سوانح عمری لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور دو مہینے میں بہت محنت کرتا ہوں سے اقتباس کر کے آپ نے یہ سوانح عمری مرتب کر کے مجھے بھیج دی ہے جو انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگی۔

(۵۶) **قریطو** یعنی سقراط کا سکا لہ اپنے شاگرد قریطو سے اس کا عنوان ہے "ہمیں کیا کرنا چاہئے" یہ سکا لہ سقراط کے نامور شاگرد افلاطون کا لکھا ہوا ہے۔ یونانی سے اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اب مولوی صاحب نے اس کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ فلکیکے ۳۳ صفحات ہیں۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ غفریب ساقی میں شائع ہوگا۔

(۵۷) **مرتب آف وٹس**، شیکسپیر کے اس مشہور و معروف ڈرامہ کا ترجمہ مولوی صاحب نے حال میں کیا ہے ابھی تک چھپا نہیں۔









